اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۱

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے منتخب خطوط،
جنگِ آزادی کے بارے میں اُن کا رویّہ،
اُن کی فارسی اور اُردو نثر کا انتخاب،
تقریظیں، دیباچے اور اُن کے عہد کی
مکمّل تصویر۔

مؤلف:

اے حمید

۱۱
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

اُردو ادب کے شائقین کے لیے روشن کتابوں کی ایک
خصوصی پیشکش

اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۱

غالب کے منتخب خطوط، جنگِ آزادی کے بارے میں اُن کا
رویّہ، اُن کی فارسی اور اُردو نثر کا انتخاب، تقریظیں اور دیباچے

مؤلف
اے حمید

۱۱
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیر مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید ۔ ایم ۔ ایس ناز
محمد حنیف شاہد ۔ عینکاف خالد

آرٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور
فون نمبر :
۵۴۹۰۸ ۹۱۸۵۹ ۳۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

غالب کے خطوط

اُردو نثر کی داستان کی زیرِ نظر قسط میں مرزا اسد اللہ خان غالب کے منتخب خطوط، جنگِ آزادی کے بارے میں اُن کا رویّہ، اُن کی فارسی اور اُردو نثر کا انتخاب، تقریظیں، دیباچے اور اُن کے عہد کی مکمل تصویر پیش کی جا رہی ہے۔ غالب کے خطوط کے سلسلے میں مؤلف نے کتاب کے آغاز ہی میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ۱۸۵۰ء تک غالب فارسی زبان میں خط و کتابت کرتے رہے اور اس کے بعد جب وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور 'مہرِ نیم رُوز' پر کام شروع کیا تو اس عرصہ میں انہیں ضرورت کے تحت اُردو میں خط و کتابت کرنا پڑی۔

مرزا غالب کی اُردو خط و کتابت کا انداز سب سے جُدا اور منفرد ہے۔ غالب سے پہلے اُردو خط و کتابت میں کسی نے بھی ایسا رنگ اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اُن کے بعد کوئی اس کی پُوری نقل یا تقلید کر سکا ہے۔ اُنہوں نے اپنے مدّعا کو بیان کرنے کا ایسا دل نشیں طریق اختیار کیا جیسے دو شخص آپس میں بیٹھے گفتگو کر رہے ہوں۔

غالب کے خطوط پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد مؤلف نے جنگِ آزادی کے بارے میں اُن کے رویّے کا جائزہ لیا ہے اور اِس کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی فارسی شاعری پر بھی عمومی نظر ڈالی ہے۔

قارئین! اِس وقت آپ 'اُردو نثر کی داستان' کی قسط ۱۱ کا مطالعہ کریں گے۔ ہم آپ کو یاد دِلا دیں کہ یہ قسط وار اَدبی سلسلہ پندرہ اقساط میں مکمل ہو جائے گا اور یوں ہمارا آپ سے کیا ہُوا وہ وعدہ پُورا ہو جائے گا جو ہم نے اِس اَدبی سلسلے کے آغاز میں آپ سے کیا تھا۔ اُردو اَدب کے طلبا کے لیے یہ اَدبی دستاویز گنجِ گراں مایہ سے کم نہیں۔

'اُردو نثر کی داستان' کے ہمراہ آج ہم ایک اہم کتاب آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں امریکہ کے جاسوسی ادارے 'سی آئی اے' کے بارے میں بہت سی باتیں سُننے میں آئی تھیں۔ "سی آئی اے اور جاسوسی کا جال" حیرت انگیز اور سنسنی خیز انکشافات پر مبنی ایک ایسی کتاب ہے جو 'سی آئی اے' کے طریقِ کار اور حربوں سے ڈرامائی انداز میں رُوشناس کراتی ہے۔

ہمارے روشن دماغ ادیب جناب سیف الدین حسام نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اِس کتاب کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔

نیاز احمد

غالب خطوط اور نثر کے آئینے میں

مرزا غالب کی نثر

غالب کی اردو نثر اردو ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ نثر زیادہ تر خطوط، رقعہ جات، چند ایک تقریظوں، کچھ دیباچوں، تین مختصر رسالوں جو برہان قاطع کے جواب میں لکھے گئے پر مشتمل ہے۔ بقول مولانا حالی اس کے علاوہ چند اجزا ایک نا تمام قصّے کے بھی ہیں۔ جو مرزا غالب نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ لطف انگیز اور دلچسپ ان کے خطوط ہیں۔ خطوط زیادہ تر اردوئے معلیٰ میں اور کچھ عود ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے۔ بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے۔

مرزا غالب ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی زبان میں خط و کتابت کرتے رہے۔ لیکن اس سال یعنی ۱۸۵۰ء میں وہ "تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے" اور "مہر نیمروز" پر کام شروع کیا۔ اس عرصہ میں انہیں ضرورت کے وقت اردو میں خط و کتابت کرنی پڑتی تھی۔ اسی سال میں انہوں نے سب سے پہلے اردو زبان میں خط لکھنا شروع کیا چنانچہ ایک خط میں خود لکھتے ہیں۔

"زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں"

حالی لکھتے ہیں کہ غالب نے شروع شروع میں اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھا ہو گا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جس کام کو اپنے لیے حقیر خیال کرتا ہے اور اسے اپناتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ وہی اس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ یہاں تک دیکھا جاتا ہے غالب کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً غالب کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے اور ان کے اردو دیوان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام سمجھتے تھے۔ غالب خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو لکھتے ہیں۔

"میرے فارسی قصیدے کو جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا مگر بہ طریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے۔ داد سخن کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں؟ مہر نیمروز یعنی تاریخ تیمریہ کے پانچ سات جزو تو کر آپ کے پاس بھیجے ہیں۔ میری خاطر نہ کیجیے۔ انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو؟"

غالب کے خطوط

مرزا غالب کی اردو خط و کتابت کا انداز سب سے الگ اور منفرد ہے۔ بقول الطاف حسین حالی "نہ مرزا غالب سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری نقل یا تقلید ہو سکی۔ انہوں نے القاب اور آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو خط لکھنے والوں نے نامہ نگاری میں لازم قرار دے رکھا تھا، بالکل ختم کر دیا۔ وہ خط کا کبھی میاں، کبھی برخوردار کبھی بھائی صاحب کبھی مہاراج اور کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بعینہٖ اس قسم کے الفاظ کے سہرے سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے مطلب کو ادا کرنے کا ایسا دلنشیں طریقہ ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے دو شخص آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا۔ میں نے پوچھا۔ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا۔ ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائیں گی؟ اس نے کہا۔ آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس مطلب کو غالب نے اپنے خط میں یوں ادا کیا۔

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے۔"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا۔ غالب کو اس خط میں یہ لکھنا ہے کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں

"اے میرن صاحب السلام علیکم حضرت آداب کہو آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ مگر میں اپنے خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اس خط کو آئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیوں ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھ سے فرماتے ہیں کہ باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر تم یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا تھا۔ اب جو وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کے اصل خط لکھتے ہیں۔ بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اس کو غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں۔ وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھتے۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں، صد ہزار آفریں۔ اردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلّی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں کی گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا اللہ برکت دے گا؟"

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں۔ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اس کے دوسرے معنی سمجھ لیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ چونکہ الطاف حسین حالی بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے۔ ان الفاظ سے دھوکہ ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی مجروح ہی کی نسبت

لکھا ہے میری نسبت نہیں لکھا اسی قدر ان کو اس بات کا خیال زیادہ ہوا کہ میں از راہِ کسرِ نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

اندازِ تخاطب

یورپی انداز میں جو کہانیاں لکھی جاتی ہیں ان میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا ان کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے، اور نہ ان کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال و جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے اور جواب کیا ہے؟ شاید قصے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

شوخیِ تحریر دیکھا

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں مگر وہ شے جس نے ان کے مکاتیب کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، وہ شوخیِ تحریر ہے۔ جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوتِ خیال جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، سیاسی، دینی اور معاشرتی مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیئے ہیں۔ سوانح عمری اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بہ لحاظِ دلچسپی اور لطفِ بیان کے آج بھی اپنا ثانی اور اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس درجے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اس کی سمجھ اور مذاق کے مطابق اور موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا لکھتے ہیں۔

"کیوں بھئی اب ہم اگر کول آتے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے۔ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچوں سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو ان کے بچپن کے زمانے میں، ان کے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں — "اے مردمِ چشمِ جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو۔ یعنی چشمِ جہاں بین غالب کی پتلی، چشمِ جہاں بین تمہارا باپ مرزا علاؤالدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خان بہادر ہیں میں تو صرف تمہارا دل دادا ہوں۔

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انہوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اس کے جواب میں اس طرح ان کو لکھتے ہیں۔

"دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں، ۱۸۵۸ء کے خط کے جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں۔ "دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

جس زمانے میں برہانِ قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مولفِ برہان کی حمایت کی ہے۔ ایک خط میں صاحبِ برہان کا ذکر کرنے کے بعد اس کی اور اس کے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں۔ "ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ ایک گائے کا بچہ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔"

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاؤالدین خان کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں —

"استادِ جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی بہن تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، دعا — اور اس رُو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام — اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں۔ بندگی — اور اس نظر سے کہ سید ہیں۔ درود — اور موافق مضمون اس مصرعے کے سوی اللہ واللہ مافی الوجود سجود۔"

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے ہیں — لکھتے ہیں —

"دیوان خانے کا حال محل سرائے سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

نواب علاؤالدین خان اور ان کے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاؤالدین خاں کو خط لکھتے ہیں — "سنا گیا کہ نواب امین الدین خان صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ چار دن رہے۔ از راہِ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے نہیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اس کو چاہتے ہو؟ ہنسنے لگے۔ غرض کہ میں نے بظاہر ان کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا اللہ مالک ہے۔"

ایک دفعہ کثرتِ اخراجات سے تنگ آ کر بعض ضروری خرچ بند کر دیئے۔ یہاں تک کہ شراب پینی بھی چھوڑ دی۔ نواب علاؤالدین خان نے اپنے والد کے اشارے سے اس کا سبب دریافت کیا اور مولوی حمزہ خاں صاحب کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ مصرع لکھا ہے

"چہ بےرشدی حافظ از میکدہ بیروں شو" اس کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔

و بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر دربار مل کو جا مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی، ہر ایک پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ اور چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر، بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے رامپور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آ گیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کیا کروں کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا رات کی شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپے مہینا بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے۔ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آ گیا۔ قرض ادا ہو گیا۔ متفرق رہا، خیر رہے۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی۔ ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خان کو بعد سلام کہنا۔

اے بجز ذلت شرب مدام! دیکھو ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ اور یہ کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہو۔ اور مسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے۔ اور عرفا کے کلام و حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دلنشیں کرنا اور ہے مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب اور ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں (نعوذ باللہ) مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام۔ بریں زیستم ہم بریں بگذرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ —

سنو مولوی صاحب! تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا: "چل پیر شدی حافظ از میکدہ... الخ" اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ جس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے۔ مجموعہ نثر جداگانہ، اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے کہ ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔"

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں۔ "سنو! عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے۔ "لمن الملک الیوم" اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار" ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو حکم حبس دوام (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پیر میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی حبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زندان میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد سے ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہیں رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ان کی محبوبہ چنا جان کی تعزیت میں لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں۔ "آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انہوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا۔ یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک ...... کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانہ ہو گیا ہوں۔ لیکن جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور ہنگامہ عشق مجازی چھوڑ دو۔"

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چنا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا۔ مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت

کے ساتھ زندگانی ہے تو اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ

زن نو کن اے دوست ہر نو بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے۔ اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں۔ حلیہ مبارک نظر افروز ہوا...... تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری بقول شیخ علی حزیں ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارہ، منہ پر داڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اس دن سر منڈایا۔ الغرض مرزا کے خطوط میں ایسے خط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں درج نہ ہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔

منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں: "بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸، ربیع الاوّل کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا کہتی تھی مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں گویا میرے نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خان کو لکھتے ہیں: "آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں۔ یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ اے نجم الدولہ بہادر! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔

اجی حضرت نواب صاحب! کیسے اور فلاں صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکو، کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے عزت! کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام، قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے۔ اس کی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں۔ صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے اور تمہارے دوست تھے۔ اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو کوئی مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

ایک اور خط میں نواب علاؤ الدین خان کو لکھتے ہیں۔ "کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم تھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ — باقی سراسر ہنود! بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں........ امرائے اہل اسلام کی اموات گنو تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامراد مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خان کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا منضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانچ سو روپے کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور آگیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلبھ گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کہاں پایا جاتا ہے۔ جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے صلحا و زہاد کے باب میں حرف مختصر میں نے لکھا ہے اس کو سچ جانو۔"

عبادت میں یاس اور آمد آشش

غالب کے بعض خطوں میں بقول مولانا حالی یاس حسرت و افسردگی اور دنیا کی

بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا گیا ہے۔ جس میں ان کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں — "ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخشدیا تو خیر اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے، اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے، اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں — "تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع و بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے۔ باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا، دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ معاش ہو، کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی! ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے، اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہو جائے گا۔"

مرزا غالب نے بعض خطوں میں اور خاص کر اردو خطوں میں مسجع عبارت لکھنے کا انتظام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات میں شمار کیا جاتا تھا خصوصاً اردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان تھی۔ وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی۔ مگر غالب نے جس قسم کی مسجع عبارت اردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے۔ اس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی آراستہ نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بہ سبب لازم ملزوم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اس شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن اور قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اردو رقعات میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

مگر یہ واضح رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاص کر ان خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کو خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر میں کرتے تھے۔ مثلاً یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو۔ مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی، نہ قید فرنگ۔"

انہیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں۔

اے میری جان، اے میری آنکھ!

نہ ہمیں ان طفلے کہ در خاک رفت
چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت۔ نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم من جملہ واقعات کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ داغ رہے گا۔"

دیباچہ سراج المعرفۃ

غالب نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفیٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اردو خطوط میں پائی جاتی ہے۔ وہ ان دیباچوں اور تقریظوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً سجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو ان میں معذور سمجھنا چاہیے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے۔ وہ بغیر ان تکلفات کے ہرگز مطمئن ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا تھا۔ اس کو اس وقت بھی لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور مرزا کے وقت میں تو یہ بہت کم دیکھنے میں ملتا۔ بایں ہمہ ان میں سے بعض نثر میں مرزا کی خاص روش میں نہایت ممتاز ہیں۔ خصوصاً وہ دیباچہ جو انہوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب "سراج المعرفۃ" پر لکھا ہے۔ اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں اس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ تفکرات اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب "سراج المعرفۃ" جس پر مرزا نے دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں مفتی میر لال صاحب نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما پر تمام اشغال و اذکار جو آں حضرت کے زمانے سے اس وقت تک سینہ بسینہ سفینہ بہ سفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کر دیئے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفت الٰہی میں کیا دخل ہے اور کیونکر ان کے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے۔ دیباچہ مذکورہ کا اول و آخر چھوڑ کر صرف وہ حصہ جہاں مرزا

نے مذکورہ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اقتباس دیباچہ "سراج المعرفۃ"

حق یوں ہے کہ حقیقت از روئے مثال ایک نامۂ سر بمہر پیچیدہ و سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے۔

لاموثر فی الوجود الا اللہ اور خط میں مندرج ہے " لا موجود الا اللہ" اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنیٔ غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں۔ آثاری و افعالی و صفاتی اور ذاتی۔ انبیائے پیشین صلوات اللہ علیٰ نبینا و علیہم اعلان مراتب توحید سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیاء علیہم کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اٹھا دیں اور حقیقت بے رنگیٔ ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب گنجینۂ ہے۔ نہ بے خامی عامۂ مومنین کی کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے ان کی نظر میں نہیں۔ جب لا الہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ کہیں گے اس سے توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدمگاہ پر آرہیں گے۔ یعنی ہمارے اس کلمے سے مراد وہ ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمت اللعالمین ہونے کے اور اس مقام نے نامی ہے مژدۂ روح افزائے "من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ"۔ کلمہ اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے، لیکن وحدت حقیقی کا رازداں ہے۔ گفتگوئے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے۔ ایک جہت خالق کی جس سے اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کی کہ جس کو فیض پہنچاتا ہے۔

؎ نبی را دو وجہ است دل جوئے خلق
یکے سوئے خالق، یکے سوئے خلق
بداں وجہ از حق بود مستفیض
بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ" معنی اس کے صاف از روئے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے۔ نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے۔ نبوت خاص سے جس طرح نبی مستفیض ہے، حضرت الوہیت سے، اسی طرح ولی مستفیض ہے۔ انوار نبوت سے۔ مستفیض کی تفضیل مفیض پر اور مستفیض کی ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصہ نبی تھی۔ نبوت کے ساتھ منقطع ہوگئی۔ مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے، مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے۔ نقل و تحویل ہوتی چلی آئی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہے گا اور اب اس کا نام ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت والمہدیہ ہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو از روئے کلمہ لا الہ الا اللہ مشہود عیون اعیان امت اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے۔ مگر وہ بات اب کہاں کہ ایک بار لا الہ الا اللہ کہے اور دل نور کی معرفت سے منور ہو جائے اور وہ ضامن زبردست کہاں کہ قائل لا الہ الا اللہ کو اگرچہ اس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو، قدم گاہ توحید پر قائم کر دے۔ یعنی رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے اور راحت بعد جراحت۔ سچ بھی تو ہے آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اس کو کیونکر تسلی ہو، یعنی اس مجموعے موجودات کو کہ افلاک و انجم و جبال اس میں ہیں نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے ؎

اے کردہ بہ آرائش گفتار ز ہیچ
در زلف سخن کشودہ را خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش می دانی
ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے کہ وہ اطبائے روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے اور بہ سبب استیلائے وہم مشاہدہ وحدت ذات سے محروم رہے جاتے ہیں، ہرچند انکو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے۔ ناچار اشغال و اذکار وضع کیے۔ تا قوت متخیلہ اس میں الجھی رہے اور رفتہ رفتہ بے خودی طاری ہو جائے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اسکو بجبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ واقعی ہمہ اوست ورنہ واقعی ہمہ اوست۔ وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔

پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا۔ بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بے خبری اور بے خودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بہ مجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں جان کر کودا۔ ایک کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا۔ انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں: یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں۔ مگر ہاں کم ہیں اور مخفی ہیں۔ اور کہیں کہیں ہیں اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بے خودی کے واسطے محتاج اشغال و اذکار ہیں۔ بہت بلکہ بے شمار ہیں۔"

"دیباچہ سراج المعرفۃ"

غالب کی فارسی شاعری

فارسی کلام میں غالب کا مقام

بقول مولانا الطاف حسین حالی۔ فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور نثر دونوں میں جو بلند پایہ انہوں نے حاصل کیا تھا اس کو اس زمانہ میں لوگوں کے ذہن نشین کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ جبکہ اس زمانے میں، جب بہت سخن سنج اور نکتہ رس موجود تھے۔ مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدر دانی کی شکایت کرتے تھے۔ غالب کے فارسی کلام کو دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیئے۔ اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو یا نثر) ہر قسم کے مضمون کو بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق ماہر استاد کو ہوتی ہے

لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے۔ اسی طرح مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ تصوف جب اہل بیتؑ فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بے باکی، بیان رنج و مصیبت و شکایت اظہار محبت و ہمدردی، حسن طلب، یہ چند میدان ایسے تھے جن کا بیان مرزا کے تمام اصناف سخن میں اکثر نہایت لطیف و بلیغ واقع ہوا ہے۔

بے شک یہ بات ان کے عشقیہ مضامین و اخلاق و موعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق کا بیان جیسا کہ ظاہر ہے، محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جس کو مرزا نے جا بجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ زیادہ میل نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے مرزا اصناف کلام میں اپنی اس قسم کی شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے۔ عام طور پر نہیں پائی جاتی۔

اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لیے موثر اور دل آویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو۔ دلوں میں گھر نہیں کر سکتا مگر اس سے غالب کی مہارت اور استادی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا کہ "ایں شیوہ ختم است بود یگراں" اور ان کا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا اور باایں ہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا۔ تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے مرزا کی استادی میں کیونکر فرق آ سکتا ہے یہ میزان ہم نے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے۔ اس کو ان کے کلیات نظم و نثر میں جانچنا چاہیے، نہ انتخابی اشعار میں جو ان کے دیوان میں درج ہیں۔"

غالب کی فارسی غزل

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشاپردازی کے متعلق یہ بات بقول حالی قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اس میں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا جس کا زمانے میں کوئی قدردان نہ تھا۔ ان کے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے جو فارسی زبان اور خاص کر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے۔ یا بادشاہ اور سلاطین و امرا تھے وہ ساتھ تھے جن کو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی فرصت تھی نہ ضرورت۔۔ وہ شخص جس کا قصیدہ خاقانی و انوری کے قصیدوں سے ٹکر کھائے جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثر پھیکی اور بے مزہ معلوم ہو۔ اس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا۔

گورنمنٹ کے ارکان کی مدح کے صلہ میں مرزا کو اس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہ ملا جو فوراً فروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔ مرزا کے ماننے والے اور ان کے فارسی کلام پر ایمان رکھنے والے بلاشبہ ملک میں بے شمار تھے۔ مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور ان کی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل نہیں بڑھ سکتا۔ پس جبکہ ممدوحوں کی قدردانی کا وہ حال ہو اور مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ چیز کہ جس کو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصل ترقی کا ولولہ نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہوتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے بلکہ اس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں جو خواہ نخواہ اس کو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اول لائیق استعداد اور فطری قابلیت جس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدردان یا مخاطب صحیح نہ ہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کیے بغیر نہیں رہتی۔ جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں اس کو مستی کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں۔ اسی طرح وہ شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے۔ بغیر اس کے کہ ملک میں کوئی اس کی قدر کرے یا اس کے کمال کی داد دے، اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دوسرے اس فطری ملکہ کو تحریک دینے والے اور اس آگ کے پتھر سے نکالنے والے کو اس بات کا یقین ہے کہ معاشرے میں کچھ لوگ ابھی تک حقیقت میں سخن فہم موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبعی اختتام کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مگر حسن اتفاق سے اس آخری دور میں چند صاحبان علم و فضل دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے ہماری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم دہلوی، مولانا مفتی صدرالدین آزردہؔ، مولوی عبداللہ خان علوی، مولوی امام بخش صہبائیؔ، حکیم مومن خان مومنؔ، نواب مصطفےٰ خان حسرتیؔ، نواب ضیاالدین احمد نیرؔ، سید غلام علی خان وحشتؔ وغیرہ، درحقیقت ان ہستیوں کا مرزا کے زمانے میں ہونا ان کی شاعری کے حق میں بالکل ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خان خاناںؒ، ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگوں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو بظاہر مرزا غالب کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ اس لیے جس طرح قدردانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا۔ اس طرح نکتہ چینوں کے خیال سے ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ اور ان کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہار کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یوں قدردان اور نکتہ چیں دونوں ان کی ترقی و ترویج کا باعث تھے۔

مولانا فضل حق باایں ہمہ علم و فضل مرزا کو جس درجے کا شاعر مانتے تھے۔ اس کا اندازہ حکایت ذیل سے ہو سکتا ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ انہوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اس نے وہاں سے آ کر مولانا سے کہا آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن کی اس قدر تعریف کرتے ہیں۔ آج انہوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے۔ پھر وہ شعر پڑھا اور مرزا نے جو کچھ معنی کہے تھے بیان کیے۔ مولانا نے کہا۔ پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے۔ اس نے کہا۔ برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ مولانا نے کہا کہ اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے کیے ہیں تو اس نے سخت غلطی کی ــــ

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع ہے ؂

اندریں شیوہ گفتار کہ داری غالبؔ
گر ترقی نہ کنم شیخ علی را مانی

مومن خاں مومن نے جس وقت یہ مقطع سنا تو اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ مرزا کو ہم کسی طرح شیخ علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔ ایک صاحب نے جو مومن کی تعلیوں سے خوب واقف تھے یہ حکایت سن کر کہا۔ مومن خاں نے اس لیے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے بہتر و بلند تر سمجھتے تھے۔ ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

غالبؔ اور خسروؒ

نواب مصطفےٰ خاں ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے ان کو بہ مراتب برتر و بالاتر سمجھتے تھے۔ نواب ضیاالدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعرا کی ابتدا ایک ترک یعنی امیر خسروؒ سے ہوئی اور ایک ترک یعنی غالب پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربی کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی اور ابو تمام ہو جاتا اور انگریزی زبان کی تحصیل کرتا ــــ تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ جب تک مرزا کی طرز خاص کو جو انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے دل میں بیٹھ گیا تھا وہ اخیر تک ان کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے۔ اس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا گیا ہے کہ مولانا ان کی سخن طرازی کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے اس کے بعد ممدوح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں ــ

؎ با چنیں اندوہ کہ گنجیم و دل خالی نشد
خواجہ اگر اندوہ گسار من نبودے وائے من
آں کہ در یکتائی وے در فن فرزانگی
متفق گردیدہ رائے بو علی با رائے من
آنکہ چوں خواہد نیاعش نامہ نامی ساختن
بر نگارد حسن مقالش کرم فرمائے من
دل بہ ریں دستم نیا باید سخن کوتہ کنید
آں کہ ننگ ارسے بودن در سخن ہمتائے من

یعنی بو علی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق کرنا اور عقل کا اس کو کرم فرمائے من لکھنا یہ سب باتیں اس کی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہم سر ہونا بھی اس کے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ اس میں قطع نظر اس کے کہ ممدوح کی اور اس سے بھی زیادہ اپنی تعریف ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے۔ اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

بیدل کا اثر

غالب کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر آزردہ اور غالب اور بعض دوسرے مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی۔ فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے۔

؎ نظارہ معنیاں از شرابخانہ تست
فسون بابلیاں فصلے از فسانہ تست

مرزا نے وہ ورق اٹھا لیا اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا: "دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے۔" یہ کہہ کر غزل پڑھنی شروع کر دی۔ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا غالب ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ ان کی عادت تھی، کہنے لگے "کلام مربوط ہے۔ مگر نو آموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی۔ مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کر کے درد ناک آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

اس وقت سب لوگ بہت شاد ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو گئے۔

صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور غالب نے اس طریق کو بالکل چھوڑ دیا تھا، اس لیے وہ مرزا اور مرزا ان کو کم مانتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور شاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مڈبھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی ان کی اصل ترقی کی بنیاد تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے فارسی غزل بھی اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں ان کے دیوان میں اب تک موجود ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفیؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں۔ جس کا ترجمہ یہ ہے ــ

> "اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی طرف مائل تھی۔ لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے، دیکھا کہ میں باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بھی بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں۔ ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے مجھ پر مربیانہ نظر ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ آملی اور عرفی کی غضب ناک نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پہ زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا۔"

غزل میں نظیریؔ کا رنگ

مرزا کے اس بیان میں پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے۔ مگر ان کی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غزل میں نہ صرف نظیریؔ بلکہ عرفیؔ، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور ان کے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے۔ ان کی غزل بلاشبہ نظیریؔ کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن طرز بیان کے

لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیات نہیں معلوم ہوتیں۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں، جن میں عنصری سے لے جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سر برآوردہ ہوا ہے۔ اس کا نام لیا ہے۔ ان کے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے۔ چونکہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اُسے نقل کرتے ہیں۔ ناظم کہتا ہے۔

شنیدم کہ در دور گاہِ کہن   شدہ عنصری شاہِ صاحب سخن۔
چو اورنگ از عنصری شد تہی   بہ فردوسی آمد کلاہِ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن   بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دارِ فانی گذشت   نظامی بہ ملکِ سخن شاہ گشت
نظامی چو جامِ اجل در کشید   سر چترِ دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد ز کار   سخن گشت برفرقِ خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید   ز جامی سخن را تمامی رسید

اس کے بعد جو کمی ناظم ہروی کے بیان میں رہ گئی تھی۔ اس کو مرزا غالب نے یوں پورا کر دیا ہے

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید   ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

اگرچہ مرزا نے بیدل اور متبعین کی زبان اور ان کے متبعین کی زبان اور ان کے انداز بیان میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا اور اس ضمن میں اہلِ زبان کے طریقے سے تجاوز نہیں کرتے تھے، مگر خیالات میں بیدل کا اثر مدت تک قائم رہا۔ لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔

غالب کی فارسی غزلیات کا انتخاب

شاہدِ حق ترا در روشِ دلبری
طرّۂ پُرخم صفات موی میانِ ماسوا
آب نہ بخشی بہ خضر خونِ سکندر ہدر
جاں نپذیری بہ ہیچ نقدِ خضر نا روا
بزمِ ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب
سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا
سادہ نہ ز علم و عمل مہرِ تو ورزیدہ ام
مستیِ ما پایدار بادۂ ما ناشتا
اے خاکِ درت قبلۂ جان و دلِ غالب
کز فیضِ تو پیرایۂ ہستی ست جہاں را
تا نامِ تو شیرینیِ جاں دادہ بہ گفتن
در خویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

●

حال ما از حیرت پرسی و منت می بریم
آگہی بادے کہ آگہ نیستی از حالِ ما
خطے بر ہستیِ عالم کشیدیم از مژہ بستن
ز خود رفتیم و با ہم خویشتن بردیم دنیا را

●

وقفِ تاراجِ غمِ تست چہ پیدا چہ نہاں
ہم رنگ از رخ ما رفت و دل از سینۂ ما
جوشے از بادہ و جوشے ز عسل دارد خلد
لبِ لعلِ تو ہم این ست و ہم آن ست مرا
خار ہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منتے بر قدمِ راہ روان است مرا
دہر در نغمۂ در دخنہ بہ آہم غالب
توشۂ بر لبِ جو ماندہ تشنا ست مرا

●

سایۂ و چشم بصحرا دمِ عیسٰی دارد
گر از اندیشۂ منزل بنود رہزنِ ما
می پرد مور گر جاں بسلامت ببرد
تا چہ برق ست کرشمہ نامزد خرمنِ ما
سخنِ ما بہ لطافت نہ پذیرد تحریر
نہ شود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما
ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

●

بہ روئے حاسداں در دوزخ کشودہ اشک
از بہرِ خویش جنتِ در بستہ ایم ما
سوزِ ترا رواں ہمہ در خویشتن گرفت
از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما
دے سیاہ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم
شمعِ خاموشیِ کلبۂ تارِ خودیم ما

●

در مشربِ حریفاں منت خود نمائی
بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

●

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
رواجِ صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاعِ میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

●

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را
رشک نگذارد کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکیِ روزم نہاں
کو چراغ تا بجویم شام را
تا نہ پندد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گر دانہ نبود دام را

دل ستاں در خشمِ غالب بوسہ جو
شوق نقش سدرہے ہنگامہ را

•

خرابیم و درخانش در خرابیہائی ما باشد
ز چشمِ بد نگہدار و خدا را دستِ کالا را
بسا افتادہ سرمست و بسا افتادہ در دست
تو دانی تا بہ سقف از خاک برداری کرا ما را

•

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب
فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب
گر پس از جور کرہ بہ انصاف گراید چہ عجب
از حیا روئے بما گر ننماید چہ عجب
بودش از شکوہ خطر ور نہ سری داشت بہ من
بہ مزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب
با چنیں شرم کہ از ہستی خویشش باشد
غالب از رخ برہ و دست نساید چہ عجب

•

غالب کی مشہور فارسی نعت

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است
آئینہ دار پرتوِ مہر است ماہتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است
تیر قضا ہر آئینہ از ترکش حق است
اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است
دانی اگر بہ معنی لولاک وا رسی
خود ہر چہ از حق است ازانِ محمدؐ است
ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد
سوگند کردگار بجانِ محمدؐ است
واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار
کاینجا سخن ز سرو روانِ محمدؐ است
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است
ور خود ز نقشِ مہر نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

•

غالب کی شاعری پر ایک عمومی نظر

پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے ایک معرکہ آرا مضمون میں غالب کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اردو تاریخ شعر میں دکنی شاعری کا دَوْر اس کا ابتدائی دَور کہا جا سکتا ہے۔ ابنِ نشاطی سے دوسری روایت شروع ہو جاتی ہے دہلی والوں نے شعر کا سرا پھر وہیں سے اٹھایا جہاں محمد قلی قطب شاہ، وجہی اور غواصی نے چھوڑا تھا۔ لکھنؤ جا کر اردو شاعری پر ترصیع و تکلف کا غلبہ ہوتا ہے۔ جس کے سیل کو شاہ نصیر اور ذوق کی محاورہ بندی بھی نہ تھام سکی۔ تاریخ شعر ایسے مقام پر اکبر آباد کا ایک نوجوان دہلی کی بساطِ شعر پر تازہ وارد کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔ اکبر آباد میں اس کی تربیت نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں نہیں بلکہ بیدل، ناصر علی، نظیری، عرفی اور ظہوری کے دبستان میں ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز تک اردو زبان بھی اپنے ارتقا کے ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی جہاں اس کے ہندی اور فارسی اجزائے ترکیبی میں جوڑ سا آ گیا تھا۔ یہ وسعت طلب تھی۔ لیکن شعرائے دہلی اسے محاورہ بندی میں قید کر رہے تھے۔ لکھنؤ کا دبستان اس کے حسنِ ظاہری سے کھیل رہا تھا۔ فکر کی توسیع کی جانب کسی کی توجہ نہ تھی۔

غالب نہ زبان سے مطمئن تھے نہ اسلوبِ شعر سے۔ ان کا ماحول نظیر آبادی کے عوامی ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ اس لیے کہ لڑکپن میں وہ اکبر آباد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں نہیں، محلسراؤں اور ایوانوں میں کھیلنے والوں میں تھے۔ اردو کے عوامی ادب سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں اپنے ہی نسب کا خیال جاگزیں نہیں تھا۔ اردو کو بھی وہ ایک درجہ اور ایک نسب دینا چاہتے تھے۔ اپنا ہی نسب یعنی ایران و عجم کا نسب اور ایسا انہوں نے کر دکھایا۔

غالب کی تمام شاعری میں اقبال کی مانند عورت مفقود ہے۔ اقبال نے عشق کی واردات کو ارضی یا مابعد الطبیعیاتی سطح پر پیش کی ہے۔ غالب کا عشق نہ جنسی ہے نہ رومانی۔ وہ حسرت و عشرت کا عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں حسنِ نسوانی کے مرقع نہیں ملتے۔ "زلف" "کاکل" "چشم" اور مژہ ہائے دراز سے قطع نظر۔ انہوں نے اجزائے حسن یا اعضائے حسن کا کہیں نہیں تذکرہ کیا۔ غالب شاید اردو کے پہلے غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے "غم روزگار" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ انسان کے لیے غم روزگار اور غم عشق لازم و ملزوم ہیں۔ ایک جگہ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ غم سے نجات نہیں۔ غم عشق کم ہونے پر بھی غم روزگار چھوڑ جاتا ہے۔

متاع و منزلت کی حسرت غالب کو ساری عمر رہی اس حسرت نے اردو غزل کو ایک نیا موضوع دیا ہے۔ موضوعِ سخن کی حیثیت سے غم روزگار کا تذکرہ غالب کی غزلوں میں کافی ملتا ہے۔ غالب کی مقبولیت کا یہ بھی ایک راز ہو سکتا ہے۔ لیکن "روزگار" کا غم تو زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ غالب کی شخصیت انوکھی اور پہلو دار نہ ہوتی تو شاید ان کا کلام اس درجہ فکر انگیز اور دل نشیں نہ ہوتا۔ غالب نے غزل کی روایات سے بہت گریز کیا اور اپنی فارسی دانی و زبان شناسی سے اردو کو ایک نئی حیثیت دی۔ ایک نیا لہجہ بخشا۔

غالب کے کلام میں موضوعات کا تنوع ہے اور ہر موضوع کے اظہار میں ان کا مخصوص طرزِ بیاں کار فرما ہے۔ غالب کے ہاں جذبے کی شدت یا حرارت تو نہیں ملتی جو میر کی شاعری کی جان ہے لیکن غالب کا بہترین کلام جذبے سے عاری نہیں یہ جذبہ خیال کے تہ در تہ نقاب میں نمودار ہوتا ہے۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

اس طرح کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ــــ

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب کی غزلوں کی ندرت، ان کے فکری پہلو میں ہے۔ اگرچہ غالب کے ہاں ہمیں کوئی مستقل فکر نہیں ملتی۔ لیکن عام طور پر غزل اسے قبول بھی نہیں کرتی اور غزل میں اس کی روایت بھی نہیں ہے۔ یہاں زیادہ تر شاعر کا موڈ طاری ہوتا ہے۔ غالب کی مابعد الطبیعاتی سطح وحدت الوجود کی سطح ہے۔ استعارے اور تلازمے بھی وہی ہیں جو اس حقیقت کے اظہار کے لیے فارسی اور اردو شعرا استعمال کرتے ہیں۔

غالب ایک چابکدست فنکار ہے۔ وہ شعر نہ تو رعایت لفظی کی خاطر کہتا ہے اور نہ صنعت گری اور بازی گری دکھاتا ہے۔ لیکن بات کہنے اور اسے سامع کے دل میں اتارنے کا ڈھب اسے خوب آتا ہے۔ وہ علم بلاغت کے تمام تصنع و ترصیع کو موقع و محل کے لحاظ سے بر سر کار لاتا ہے۔ اس نے ایسی صنعتیں استعمال کی ہیں جن کا کتب بلاغت میں کوئی نام نہیں۔ اس سبب سے اس کا ہر لفظ بلاشبہ گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ ابہام کے کتنے اقسام ہیں۔ کب شعر کے لیے یہ زلفِ گرہ گیر کا حکم رکھتا ہے اور کب زنجیر پا بن جاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

؎ میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

لفظوں کے استعمال کا جیسا غیر معمولی شعور غالب کو ہے، اردو کے بہت کم شعرا کو ہے۔ ایک طرف انہیں فارسی فرہنگ و آہنگ پر عبور، دوسری طرف دلی کے روزمرہ اور محاورے پر دسترس۔ یوں غالب نے بلاشبہ اردو ادب کی محفل میں ایک انوکھے انداز سے بساطِ شعر آراستہ کی ہے۔

غالب اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ابتدائی کلام زیادہ تر اردو کا ہے۔ دوسرے دور سے فارسی شاعری پر خاص توجہ ملتی ہے۔ دو زبانوں کا شاعر ہونے کی حیثیت سے اس بات کا امکان تھا کہ ان کی دونوں زبانوں کی شاعری میں ایک جیسے اشعار کثرت سے ملتے۔ تعجب ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ صرف چند ایک اشعار ہیں جن کا مطلب ایک جیسا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔

فارسی

اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

اردو

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

فارسی

ہائے ایں پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد
بود با دامنِ پاکت چہ قدر ہا گستاخ

اردو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی جاناں کے دامن کو کبھی میرے گریباں کو

فارسی

گلے بر گوشۂ دستار داری
خوشا بختِ بلندِ باغبان

اردو

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

یا

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

فارسی

دگر ز ساز بے خودی ما صدا مجوے
آوازۂ شکستنِ ساغر خودیم ما

اردو

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فارسی

شکستہ رنگیِ تو از عشق خوش تماشا نیست
بہارِ دہر بہ آئینۂ خزانِ تو نیست

اردو

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

فارسی

لالہ و گل دمد از طرفِ مزارم پس مرگ
تا چہا در دلِ غالب ہوسِ روئے تو بود

اردو

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب اور مثنوی

ایران کی قدیم کلاسیکی مثنویوں پر غالب کی بڑی گہری نظر تھی۔ جامی، نظامی اور فردوسی کی روایات سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ اس کے باوجود غالب فارسی یا اردو میں کوئی قابلِ ذکر اور بلند معیار کی مثنوی نہ لکھ سکے۔ بقول رشید احمد صدیقی ــ

"غالب میں عقیدہ و عمل کی اس تپش و توانائی کی کمی تھی جو بالعموم مذہب اور ماورائیت کی دین ہوتی ہے اور جس کے بغیر بڑے کام انجام نہیں پاسکتے۔ غالب میں عصبیت بھی آئیڈیلزم نہیں تھی۔ غالب نے فارسی میں متعدد مثنویات تصنیف کی ہیں جو اپنی جگہ پر خوب اور بہت خوب ہیں۔ ان میں سے ایک بیانِ معراج بھی ہے۔ اس میں جہاں تہاں مولود شریف کا انداز آگیا ہے اور یہی وہ چیز تھی جس کی غالب سے کم سے کم توقع کی جاتی تھی۔ معراج پر لکھنے کا غالب کو حوصلہ بھی تھا اور صلاحیت بھی

لیکن جن مکروہات و مصائب میں وہ مبتلا ہو گئے تھے ان سے نجات نہ پا سکے اور نہ عہدہ برآ ہو سکے۔ معراج دراصل مجاہد مفکر اور صاحبِ یقین کا موضوع ہے۔ جب تک شاعر یا فنکار میں یہ تینوں صلاحیتیں موجود اور برسرِ عمل نہ ہوں گی۔ اس موضوع پر کوئی بڑی نظم یا مثنوی نہیں لکھی جا سکتی۔ مذہب و ماورایت سے قطع نظر غالب اگر انحرافِ عظیم یا انکار ابلیس پر کوئی مثنوی تصنیف کر سکتے ۔۔۔ تو یقیناً ان کی غزلوں سے وہ کم مقبول نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ اردو مثنوی کی قدر و قیمت میں جو گراں بہا اضافہ ہوتا اس کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر غالب کیا کرتے۔ قدیم مثنویوں کی رزم اور بزم کی داستانوں کے لیے جس طرح کی اساطیری فضا، مافوق الفطرت کردار اور ان کے محیر العقول کارنامے سازگار ہوتے تھے۔ اب ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ گئی۔ انسان نے خارج پر اتنی قدرت حاصل کر لی ہے کہ تخیل کی جو بہ تراشی کا کیا ذکر، ماہ و مریخ کی تسخیر میں بھی کوئی کشش نہیں رہ گئی۔"

"غالب کی شاعری" (غالب نمبر۔ نقوش)

غالب کا لہجہ

غالب کا بات کرنے کا سلیقہ سب سے الگ ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ جدت پسند ہے اور اس کی افتادِ طبع سب سے الگ اور شاعری کی قدیم روایات سے مختلف تھی۔ مثلاً خدا اور انسان کا رشتہ ایک تو غلام اور آقا کا ہے۔ اور دوسرا اس کے نائب ہونے کا ہے۔

غالب کے ہاں خدا اور انسان کے مابین جو رشتہ ہے اس کے متعلق بھی ہمیں اس کا لہجہ اور انداز سب سے الگ قدیم روایات سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن بقول رشید احمد صدیقی ایسا بھی نہیں ہے کہ خدا کے نائب اور نمائندے کا ہونا چاہیے۔ وہ خدا کی عظمت و رحمت کا اتنا احترام نہیں کرتے جتنا اپنی ذاتی محرومیوں اور حسرتوں کا ماتم کرتے ہیں۔ غالب جبر پر بھی طعنہ زن ہیں اور اختیار کا حق ادا نہیں کرتے مثلاً۔

؎ ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

؎ ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر
نہ ملی داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

؎ لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

غالب اور شراب

غالب پہلا شاعر ہے جنہوں نے شراب کو اپنے لیے عیش و عشرت کے واسطے نہیں بلکہ یک گونہ بے خودی کے واسطے جائز سمجھا۔ وہ شراب زیادتی غم غلط کرنے کے لیے نہیں پیتے۔ وہ اپنی عشرتوں کو دوبالا کرنے کے لیے نہیں پیتے بلکہ محض بے خودی کی کیفیت کی خاطر پیتے ہیں۔ یہ بے خودی غمِ روزگار سے نجات نہیں بلکہ حقائق سے باخبر ہونے کی تپش سے نجات حاصل کرنے کی سعی ہے۔

؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

شراب کی حرمت اور محبت میں غالب نے جو اشعار کہے وہ صرف اردو کا حصہ ہے۔ فارسی میں بھی ان کے ہاں شراب کی تعریف و توصیف میں اتنے بلیغ اشعار نہیں ملتے۔ ملاحظہ کیجئے چند اشعار۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

•

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

•

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

•

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

•

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

•

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

•

غالب کی فارسی نثر

مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جاتا ہے۔ ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً کلیات نظم کا دیباچہ اور خاتمہ، مہر نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور وہ دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں، اور مکاتبات کا ایک معتد بہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوئیٹکل نظم و نسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر وحید اور جلالائے طباطبا بڑے نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ ان کی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے۔ مگر وہ بھی اپنی شان اور آن بان میں بے نظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہیے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرزِ انشا پردازی سے استفادہ حاصل کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی آم کا مزا ڈھونڈنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل وغیرہ کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن جب مرزا کی نثر کا ان دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا

کی کوئی ادا ان کی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں ان کو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی لیکن چونکہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلبستگی نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسب وعدہ ان اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے جن کو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اس کی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے۔ مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہم کو امید ہے کہ یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کافی و وافی ہوگا کہ مرزا نے نثر فارسی میں بھی اس قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا جیسا کہ نظم فارسی میں ان کو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا تاوقتیکہ اس کو دلیل اور زبان سے ثابت نہ کیا جائے ایک بے معنی بات ہے لیکن ہم کو ان لوگوں سے جو وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرا ہیں،

چونکہ مرزا کی انشا پردازی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں اس لیے جہاں تک ممکن ہوگا ہم ان کی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کریں گے جو صاف اور سلیس ہوں اور بایں ہمہ جہاں ضرورت ہوگی کہیں بین السطور سے کہیں بریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائیں گے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زباندانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً آمد کو سد شصت کو شست، غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن، گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آدر اور تدرو وغیرہ وغیرہ چونکہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے اس لیے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقہ کے موافق لکھے گئے ہیں۔ نادرۂ سلیمان آمدو سلطان۔ مصطفوی تو سلیماناً۔

نثر فارسی کے نمونے

مہر نیمروز خطاب زمیں بوس۔ مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدح بادشاہ کے بعد ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کر کے اپنا درد دل بیان کیا ہے اور اس خطاب کا نام خطاب زمیں بوس رکھا ہے۔ اس کو کسی قدر حذف و اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

۔۔۔ تا آن شیوۂ خاقانان و خواقین خدایگانا بودے آوردن من از عدم بوجود بسودائے گہر سنجی و گہر فروشی بود، کالائے بیش بہائے من درین چار سو رو رواج نہ پذیرد، و متاع گرانمایہ مرا درین بازار ارزش ارزانی نہ شد، ناچار ہرچہ باخویش آوردہ ام۔ چوں گوہر کہ باخویش می برم (قدر و قیمت)۔ لختے در سفینہ ہا و پارۂ در سینہ ہا میگذارم، و میگذارم و میگذارم (چگونہ) پس از من آن گنج شایگاں را گر ہمہ باد ببرد گو ببرد اگر بہ خاک بخورد گو بخورد۔ سینہ آرزو ہائے جوان میرد را (جوان مرگ) مدفن ست لعبۂ نگاہ گرمم (بالکل) چراغ گور غریباں باد۔

نیاگان نامہ نگار از تخم افراسیاب و پشنگ بودہ اند و فرماندہاں با فر و فرہنگ (اجداد) فرد۔ مردن (نسل) چراغ ہستی تور و دیدۂ تور بہ باد آتش کینۂ کیخسرو پشنگیاں طلعہ۔ سیاہ چشی آورد و خداوندان اورنگ و دیہیم (تاج) را از اں برگ و ساز جز تیغ گند ناگوں بخت نماند، برزِ بوم بیگانہ رو می آوردن، و بدست مزد تیغ زدن نان خوردن ہم ازیں نیستان (ملک) ایرانان کہسار نشیمن، سلجوقیان دگر بارہ سر بافسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخ گردندہ چنانکہ خوی اوست ایں نامداران کاوس کوس را نیز از پای افگند۔

در مشرب ما خواہش فردوس نجوئی   در مجمع ما طالع مسعود نیابی
در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینی   در آتش ہنگامۂ ما دود نیابی

از والیان ایں قافلہ نیائے من کہ در قلمرو ماوراء النہر، سمرقند، مسقط الراس وے بود چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہند آمد (جائے ولادت)، در دفتر سپہبد شاہ نشان ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں توقیع نوکری شاہش نوشتند و پرگنۂ پاسو برات روزی وے و سپاہش نوشتہ، پدرم پیشۂ پدر خویش داشت، و ہم در کارزار جان سپر گذاشت۔ ہمانا گلبن ثنائے ترا تو آئین نواطبلے ہمی بایست کہ مرا نہ مرزمنج روشانسرائے آفریدند۔

رباعی

غالبؔ بگہر ز دودۂ زاد شمم   زاں رو بصفائے دم تیغ است دمم
چوں رفت سپہدی زدم چنگ بشعر   شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

خاکم بسر کہ بغریب پنداو آزادہ روی بسخن لاابالیانہ پرداختم؛ و اندازۂ دانش سخن و پایۂ والائی گوہر خویش نشناختم، سینۂ من لختے داشت بروان آسائی نہچہ کر از نشتر زار و ز نہ و از یار زدہ من کہ دم جز بہ پاپست نہ زدم عربانِ مرا قلبے بود۔ بدجلا باری ابرے کہ از قبلہ خیزد بیہدہ کوش۔ من کہ باراں نشوہ زار فرو ریختم۔

بااین فروغ گوہر درخشانی نہاد   زیں سال سیاہ روز کہ اکنوں روزگار

بافر و فرہنگ بیگانہ، و باہام و ننگ دشمن، بافرومایگاں ہمنشیں، و با اوباش ہم رنگ پاے بیراہہ پوے، و زبان بیہودہ گوے، در شکست خویش گردوں را دستیار، و در آزار خویش دشمن را آموزگار، دل پُر از خار خار و دیدہ نمشیزہ ز آں رو ستگاہ خود نمایی آو ایشے، وہ سرو برگ آزاد از آسایشے سرگذشت ہر کس ہاں فرماں ہائے اعضا پذیرفتۂ سرنوشت اوست، وہ آنچہ بر من رفت و دستاں را باسن چہ جائے سرزنش و مرا باد شمناں چہ گنجائی پرخاش۔

ہنگ گسست (گنجائش) مہرہ کشتی شکست ہیچ   دانا خورد دریغ کہ نادان چہ کار کرد

پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزی رفتار من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت و خانقاہ و بتکدہ را یکدگر زد، بفروغ آں فرۂ ایزدی کہ فریدوں را بہ فرتاب داد گرمی دل افروخت، و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت بداں و فرد دم آورد ندکہ اگرچہ حلقہ۔ چنیں بداں وو داری و نوائی کہ دیدہ ویدی۔۔۔ تا ہمسایۂ ادیم سپہریاں در سایہ من اند و تا خاک نشیں آں درم فرشتگان دو دو رنگ پایۂ من اند، و دل و دیدۂ بدوستاں جائے من ست، و پرسراہ دستارہ پلئے من درین گوشہ گزینی و خوشہ چینی (استادگان) نخست آیۂ رحمتے کہ بر من از بالا فرود آمد، رو داون نخستگی بذمیں بوس گیہاں خدیو خداداں بود، دولت روے آورد، بخت از خواب جست، حور چشم روشنی گفت رضواں برضا جوئے آمد، چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ تجلی طلبید

(نسرد)

نومیدی از تو کفر و تو راضی ز بکفر　　　　نومیدیم وگر بہ تو امید وار کرد

کالبد خاکی مراچوں پیکر گرد باد جانے در میاں نیست ہمیں یک دو رسر گشتگی تماشا دارد۔ گر عندلیب گلشن تصویریم کو بوے گل زمزمہ از دے تواند دمید یا سبزۂ جوہر شمشیرم کہ بوزیدن باد ستانہ نیارد چمید۔ گسستگی پیوند نشاط کہن شد و خوں از دلی ہمچناں در چکیدن نست (نخواند) تا پیوند چہ قدر استوار بود؟ و چہ مایہ بہ زود گسستہ اند۔

سے بادل دیوانہ کہ گفتمے از من ہوشمند تر ست۔ گفتم کہ اگر بگفتار بزد ہی بشاہ ادم کارگاہ بارگاہ عرصہ دارم کہ آئینہ رازم۔ مرامی تواں ز درد دبندہ، سخن طرازم، مرامی تواں پرورد گفت۔ اے ناداں ایں سخن از جائے دگر بود و ہنگام آں گذشت اکنوں اگر ہمی توانی گفت بگوئے کہ خستہ ام مرہم می تواں نہاد، و مردہ ام، جان می تواں بخشید۔

رباعی

شاہا ہر چند در پے جوے آمدہ ام　　　　دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام

آبم کہ بجلوہ ابجوے آمدہ ام　　　　دگم کہ بہار درا بہ روے آمدہ ام

اگر چنانکہ بدوران توام۔ بروزگار فرزانہ جمشید بودے، جمشید روزگار را آفرین گفتے، و اگر بہ انساں کہ ثنا خوان شہریارم فرخ فریدوں را ستودے، فریدوں چرخ دستارہ را گہ دو سر گشتے، در اں انجمن کہ زردشت آتش افروختے، ازشہ آدرد۔

اگر من بدیں دم آذرفشاں جاداشتے آذر از بیم من زبانہ نہ زدے اندر عربی بیان من کس بشنیدن ژند نپرداختے من بدیں فرخی بخت　　　　کہ چوں تو خداوند کار فرما دارم۔ ہر قدر بہ خویشتن بنازم جادارد سرت گردم! تو نیز بدیں گرمی ہنگامہ نیاز کہ ہمچو غالب بندہ آتشیں نواے داری، اگر بہ اندازۂ ہنر داد التفات میدہی جاے مردمک دیدہ بیں باز گمزاد و دیدل بروے من بکشائے۔

گر ہند در عہد جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی بفرماں آں خسرو دریا دل کلیم را صد ۂ

بسیم و زر لعل و گہر سنجیدہ اند　　　　امن آں خواہم وبدہ وداں داد ستودی۔

وہی ماراز گفتش کوشش نہ　　　　بجندد یکبار گفتار مرا با کلام کلیم بسنجند۔ پریشان آنانی من در ستایش گفتار خویش اگر خود گزاف بناشد، گفتار راست بگستاخی گزاردن ہم از انصاف بناشد۔ آخر نہ ہمانم؟ کہ ہمہ وقت خود را ہیچ شمردے وہیچگاہ بر خود گمان کاسے ہنر دے سرمستی ذوق برگزیدن ایں والا نظر کہ برگزیدۂ تست مرا ز من بُرد و خامہ بے پروا بوے را بدیں روش و آہنگ بخراش و رامش آورد۔ ہمانا بلند نامی سلطان دہر و آفاق چشم داشت، چوں منے را کہ بجادو بیانی شہرۂ آفاقم بجر دار گزاری گماشت۔ من خود از اں رو کہ دل وزبان ایں بیدار مغز آئینہ دار دل وزباں شاہ است　　　　دانم کہ آنچہ عمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمود فرمان شاہ ست۔

بادشاہاں را ثنا گفتن نہ کار ہر کس ست　　　　دیدور شاہے کہ کار گفتن اندازہ بمن

نامہ نگار کردار گزار دراپہ تو مندی توفیق سرانجام خدمت۔ سعادت جاودانی خاقان را بہ سایہ سواد ایں نگارش کہ ظلمات آب حیوان ست حیات ابد اندوزانی باد:

فخریہ فقرے

مرزانے مہر نیمروز میں جہاں سبب تالیف کتاب لکھا ہے اس کے آخر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کسر نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرز بیان کی داد لوگوں سے چاہوں تو یہ کوئی بیجا بات نہ ہوگی بلکہ عین تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائے گی۔ اس کے بعد کہتے ہیں کالا شناسی را نہ آں آئین ست کہ کوئی کالا ے خویش از نظر انداز ند و برکشائی رانہاں دستور ست بر سر پکیرے کہ خود کشتہ عشق نہ باز ند، گرمائی آں نقش (مصوری) را کہ خود بیند از اعجاز نمی شمرد) و آذر آں بت را کہ خود می تراشید نماز نمی برد دیزدان را بندہ سپاس گزار باشم اگر قلم را بہر جنبش آفریں بگویم، و از سخن بہر اندیشہ پاک نہ پذیرم۔ رفتار کلک و تمرد دل از دست برد و خرام ایں رعنا لعبت رقاص سرمست نکند۔ حاشا کہ خراش کلک بر ورق ایں مایہ ذوق انگیز تواند بود۔ تیر ست کہ بیشلہ در حالت سرمستی تقسیم خود نمایانہ بنازی خرامد ایں پارسی آمیختہ بہ تازی　　کہ از زماں　　　　چہرہ دستی عرب بر عجم در گیتی پدید آمد خسروی گنجینۂ در بستہ بود کہ خامہ من قفل درش　　　　را کلید آمد۔ پرویز کجاست تا بنگرد کہ دریں رہروی کدام رہ سپردہ ام، و بہرام کجاست تا فرا رسد کہ سخن را از کجا بکجا بردہ ام۔

خسروی باد دریں دور اگر میخواہی　　　　جیش ما آئے نہ جزءے از جامی ہست

خود ستائی فرد علم و بند پندار بگسلم۔ آدم از اں روزگار، کہ از خوے بتاسازی وا نگاہ بیانی سپری شد، وداد از اں بیداد کہ در روزش افروزنی خشم و کام بر دواں دہوش رفت۔ از کار فرماے ایں نگارش سپاس پذیرم کہ ہم، داختن ایں خط کہ خود را چوں سایہ بازمیں ہموار ساختہ ام، تا پرداختہ ام و با گفتن ایں نقش۔ کہ چشم و دل و نگاہ و نفس باہم آمیختہ ام، تا انگیختہ ام۔ دست از کارہاے دگر کوتاہ است، و دل از اندیشہ ہاے دگر برکنار تا مہ نگار کہ از کہ وارگزاری بگفتن در دل روی آوردہ بود باز بہ پاے سخن می آید، و جادۂ کہ نشان دادہ آمدی بپیماید تا نگاں ہمہ تن چشم باختہ و شنونداگاں سراپا گوش۔"

طرز واقعہ نگاری

مرزانے مہر نیمروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں یہاں دو ایک مثالیں اس کی بھی لکھی جاتی ہیں

"خان خطا با خویشتن سنجیدہ کہ با قہرمان قوم مغل مہر درزد و مہر انگیز نامہ روان داشت و گزیدہ دوستے را بہ نامہ بری و میانجی گری گماشت، فرستادہ آمد و جہاں پہلواں قبل خاں را زمیں بوسیدہ، و نامہ سپرد، و پیام گزارد و حرف و دآشتی بود نہ در فرو گذاشت تا جولی بہادر را بجاے خود نشاند و بمہمانی ناسر آورد و توسن تیز گام سوے خطا راند و فرماندہ آں کشور مہراں عنکہ را پذیرہ فرستاد، و مہماں را بجو شتر میں نشیمن فرود آورد۔ دو پادشاہ سپہر بادہ نگاہ بر یک خواں نشستند، و ناں خوردند و در اوق آشامیدند۔ گر خود پیشہ قبل خاں را و را اندیشہ گذشتہ باشد کہ مباد اخطائیاں زہر کا بہ بادہ آمیز ند بدیں رنگ خون مہماں بریزند، دو ہر بزم بس از اندک مایہ درنگ بہ بہانہ آب تا ختن بروں آمدے و بہ ستم تنگو نہ کردے و خوردہ آشامیدہ اندر ہن فرو ریختے۔ چوں بہ بزم اندر آمدے دگر بادہ ساغر گرفتے و خوردنی از سر گرفتے۔ خطائیاں بہ شگفت فرو ماندہ کہ یارب ایں چہ نیرو مندی در آورکسی ست کہ از ما بیشتر می خورد و خورش را بروے گرانی نیست و از فروتری کشد و ہشیار تر از ماست۔ میکشاں دانند کہ چوں بادہ پُر زند در مادام خورند ہر چند ہر بار بشگوفہ اندازند۔ نہ آنست کہ مستی روے ندہد و تاب دز بونی قے منش را باہم برزند۔ سے بادہ بر خود زور آورد و قبل خاں ریش داد اے خطا

که النا‌خاں نام داشت. گرفت و لبوے خود کشید و ناسزا گفت. میزبان خشم فرو خورد، و نزدیکان خود را که بهم بر آمده بودند از گستاخی باز داشت. بامدادان مهمان آهنگ بازگشت سرود. میزبان که از بدمستی دوشینه سرگران بود چنانکه میزبانان دامن مهمان زود از دست نه دهند، و آرزوے دیرماندن کنند. کمر و کلاه هاے گوهر آگیں، و کمرهاے زرّیں، و درخشنده نگیں هاے بیش بها، و بر لبسته هاے پرنیان و دیبا پیش کشید، و پدرود کرد. هنوز رهرو دور نه رفته بود که بدآموزان النا‌خاں را از جاے بردند، و بر آں آوردند که قبل خاں را، از راه برگردانند و بدرگاه آورده کالبدش را بدست دشنه و خنجر از هم فرو کشانید. سخن بزمی گزارنده ستاره از سپهر فرود آرنده بدیں کار کمر بست و قبل خاں را براه دریافت، و بیانه آمدن قرابت رسیده رام نه شد و از راه برنگشت. فرستاده تنها باز آمد و بعرض رسانده خبر دار گردید از گرداں و یلاں فرمان رفت که جلوگسسته شتابند و هر کجا یابند اگر بشادی در داوی نیاید بخواری و زاری آورند. مگر قبل خاں را براه دوستی بود از دوده ستوده سلجوق بکاشانه وے فرود آمد. دائم از سپهر آسائش آهنگ و دو سه روزه آبخور رو داشته باشنه خطائیان شوریده مغز وراں در رسیدند، و خان را در آں خانه دیده نه سخن بدان ابه ساز کردند که خاقان فریب خورده، و خواست که سوے خطا برگردد و خانه خدا گر فرو دا مهر فزوں داشت نهفته باد پاے پیش کشید و گفت کارها دگرگون است بر رفتن بخطا خود هیچ روے روا نیست. تنها بریں گرده میاوید زبریں بادتوس نام برنشیں، و سوے اہل و الوس بگریز. ناگزیر همچناں کرد و جان گرامی به تیزگامی برد. خطائیاں روے باز گشتن نداشتند بے امیدگاه تنگ پوے خویش. برداشتند خاں سپهر آستاں تخت بآرامش جا رسید و خطائیان پس باقاجولی بهادر و قزانگان سگالش رفت که چه می باید کرد انجام کار سه یکه گرخواهاں را کشتند، تا زهمینکه کشتند چه درودند.

شهریار قبل خان از یک بانوے نکو دیدار که از قوم منغرات بود شش پسر داشت نخستیں را دومیں بهادرگیں برتاق و قوبله خان نام آورد دیگراں به نامهاے دگر روشناس. روزے نخستیں ایں دو برادر نام آور ناگاه بشکارگاه از همرهاں جدا می ماند، و راه گم کرده هرزه همی گرد تا تاره خانیاں که غارتگری پیشه داشتند، و پیرامن قلمرو مغول همواره راه میزدند بایں شهسوار پریشان ر فتاده بر تنجودند. و چوں می دانند که کیست باسیری می برند و بالتا خان خطائی می سپرند. خان که دلے برداشت فرمان می دهد که شاهزاده را بر خر چوبیں به میخ هاے آهنیں بدوزند تن نازنینش از دوال بپردازند. نداد خوشتان را که از پیش رنجور بود جگر تابی ایں داغ درد افزود چوں دانست که ناکام همی باید مرد دومیں پسر خویش قوبله خاں را به جانشینی گزید. و کشیدن انتقام خون برادر وصیت کرده چشم از تماشاے جهاں پوشید قوبله خاں متاگیں سلیمان بخت آورد و بفراهم آمدن سپاه فرمان بنشت فرمان بران و کینه خواهاں از هر سو به تخت گاه رو آوردند.

شهنشاه را تا دل دیده ور   که چوں لعل بودے سراپا جگر
بر آں شد که لشکر فراه آورد   لبوے خطا تکتاز آورد
ز مرداں دگرداں دکند آوراں   بجنبش در آورد کوهے گراں
از آں رو که بالیت خونریز شد   منش ها بخوں ریختن تیز شد
دلیراں نه دشمن کشی دم زدند   ز دم باد بر روے پرچم زدند
نه تا تار تا گرد انگیختند   نه بنگاه خان خطا ریختند

النا‌خاں دل و دست وعناں و سناں بکار در آورد، و خود با سپاهے از ستاره بشمار افزوں تر به پیکار در آورد کوشید و کوشیدن سود نداشت رقم فیروزی بنام قوبله خان کشیده بودند. شکیبائی گسل شکستے به خطائیاں افتاد علم بادشاه نگون شد و اندیشه گریز رهنمون جانیاں النا‌خاں جگر گیتی جان بر دو تن هاے خسته دو لهاے شکسته از میاں برد. بشهر اندر آمد و در بر روے سپاه کینه خواه بست. قوبله خاں و لشکریانش نه آنمایه برگ و ساز به یغار بودند که در اندیشه قلعه گیری سپاس گزار چرخ دا اختر گشتند، و گرا تباد و سبک عناں برگشتند. بادشاه بچشم روشنی پیروزی در بزم سور آرائش یافت خواهی هنگامه گرم کن و خواهی بزم آرائے برگ داد آں خدنگ به کماں بست که خطا کند، قوبله خاں، را بهنگام نوشیش ناوک بر نشان خورد. چوں پسر نداشت برتان بهادر جاے پدر را نه برادر گرفت بسکه دلیر و مردانه بود نامش از خانی به بهادری در جهاں رفت. بروزگار جهانداری ایں شهریار دلاور برق اجل خرمن هستی قاجولی بهادر سوخت، و پسرش از رحمی برداش پسر لشکری رنج افروخت.

روزے میانه امیر قزغن و امیر طراغاے در باره الوس دلکشوں سخن می رفت و فرزانه فرزندی فرا امیر تیمور دلاور با پدر همزباں بود. پدر را از گفتار باز داشته خود بشگرفی سخن سرا گشت، و بدان هنجار نغمه چند بر تار گفتار زد که امیر قزغن در آں شیوه بیانی و گهر افشانی بهر دل بست و با آفریں زبان به گشاد سخن گوے فرو نهد او را ادا پسر خواند، و همدم بزم.

ادلجایو ترکاں

خواهر امیر حسین نبیره خویشتن را بآئیں دین و قانون شرع بوے سپرد تا خویشی بر خویشاوندی افزاید و آمیزشے چوں شیر و شکر در میاں آمد. امیر جهاں بوے پس از آں پیوسته با امیر قزغن در بزم همنشیں و همدم و در رزم پیش تاز و پیش آهنگ بودے از نبرد آزمایاں برلاس و دلاوران چغتائی هرکه آں دست برد و شگرف نگفتی فرو ماندے دو دست مریزاد گویا بر آں دست و بازو آفریں خواندے

پس از امیر قزغن که داماد ش تغلق تیمور ناگاه در شکار گاه کشت جهاں پهلوان تهمتن تواں به تنها دامن همت والا گرفت و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش بالا گرفت.

هر چند که زشت و ناسزائیم همه   در عهدهٔ رحمت خدائیم همه
در جلوهٔ دید چناں که مائیم همه   شایستهٔ لعنت و بوریائیم همه

برادر زن صاحبقراں همانا امیر حسین نیز بوے پیوست، و عهد بست که هرچه از ملک و مال و برگ و ساز گرد آید به یکدگر بخشش کنیم و باهم جز مهر، و با قوم جز آزرم، و با خلق جز داد نه ورزیم. بجوں گرمی ایں دو گرد دلاور و دو شیر مرد هم گهر هنگامه گرمی پذیرفت، و گزیں دستگاه سے دستگاه پاهے فراهم آمد. صاحبقراں نه از سادگی بلکه از آزادگی دل بازباں یکے داشت و امیر حسین همواره در کمیں آں بودے که نباز را از میاں برد و یکتائی علم دارائی افراز و از دیده وری بسگالشهاے آں نشر ند اندیشه تا راستی پیشه پے بردے و از فرزانگی و مردانگی هیچگاه بروے نیاوردے.

ستم بجاں کسے اندیش می تواں کردن   خجل ز راستی خویش می تواں کردن

رزنگاے در از تراز رسته طول امل با ملوک طوائف در کجداد و مریز دستیز و آویز گذشت همگناں چشم براه گوش بر آواز داشتند تا یل اسفندیار بیزدر از کدام سو چشم زخم رسد. دیده امیر حسین که جز زیر بود و خوے در رنگ و نیرنگ کار نمی کرد.

و در انبازی و دو سازی. فتنہ پردازی و شعبدہ بازی شیوہ داشت. نیرنگ سازیِ اقبال عدو مال صاحبقران کشورستان را نازم کہ ہم آں گروہ بے شکوہ را سوی سپرِ پلے بلنگ خوردہ و ہم ایں گروہ بے دستبرد را بجا دست از کار رفتہ. صدرہ اتفاق افتادہ است کہ ایں نفاق پیشگان فرو دشمن خون گرفتہ را از نژاد چغتاں دست گرفتہ بر تکیہ گاہ خانی و مرزبانی نشاندہ اند و زود دیدہ شمشیر بر سرش راندہ اند تنہائے پیلتناں را مسند و تیغ از پے ہم ہیا بود، سرہائے سروراں را نابالش و خشت گور از پس یکدگر آمدہ.

سپر شارہ در روشِ چرخِ نیلگوں — اینہا کند ہر آئینہ در مذہبِ حکیم
امّا من آں نیم کہ پسندم طریقِ وہم — زاختر چہ شکوہ چوں نبود جز خدا قسیم
نبود بجز ظہور صفات و شیون حق — صلح و نبرد و فتح و شکست امید و بیم
توقیع معنویست گر الفاظ و رقم — تشریف خسرویست گر اطلس و گر گلیم
از حق بود اضافۂ ہستی بہر صفت — جندایہ تو دا بچہ بہ سائل بود کریم

ہمچنیں بارہا امیر حسین را از درماندگی و زبونی کار سخت افتادہ است و سلطان سام ہم آورد، افراسیاب ہمتا. بہ لابہ گری دے بخشودہ بیاری و یاوری دل نہادہ است. کینہائے نہانی امیر حسین آشکارا بود بہ می دانستند، و تیمور ہمواں از ہمہ فزوں تر می دانست کہ در ضمیر حق پذیر آزادم نا گزیر می گزشتہ باشد کہ گمراہی سست مہر خواہے ذشت و کردارہائے نکوہیدہ بگذارد و جاندار او گر نیاداستی و جہانیاں را پس برہ راز دستی نیازارد. آں تا جوانمرد افرۂ ایزدی کجا کہ بخشودہ کام نگرد و راہ دانش و داد و دو رہ آزردن دل آزادم (شرم) نداشت و در بردن شکیب، و در کشتن خلق پروا.

تو پارسا طلبی عاشق و من آں رندم — کہ نے بحلقۂ او باش آشکار کشند

پایان کار لشکریانش از ناخوشی ستوہ آمدہ آں جواں میر خدا گیر را با مہر چہار پسرش گرفتہ آوردند و بخداوندگار سپردند. دارائے نبرد آزمائے را آہنگ عاجز کشی نہ بود و خوں گرمی پاداش (یعنی جوش انتقام) نداشت می خواست. تا بخشودنی بخشودگان و گناہاں نابخشیدنی بخشیدن از نہاد اہلِ بزمِ خردگیر برخاست خاصہ شاہ محمد مرزبان بدخشاں، و شیخ محمد بیاں سلدوز ذا امیر کیخسرو کہ دیشہائے لودنا سورہائے کہن داشتند زخم تیز تر زدند، و بنواہائے خونچکاں، خونابۂ فغاں فغاں بر آوردند کہ ما قصاص خوں ہائے ریختہ می خواہیم نہ انتقام فتنہ ہائے انگیختہ کہ والی ولایت آں ذا بجل قرار کرد. ناگزیر بدیں گفتار فرجام گیر و دار بشرع حوالت رفت کارآگاہاں دانش پناہاں خوں ریختن فرمودند. و سادات و علماء بکشتن فتوی دادند.

پنداری چوں خوں گرفتہ اینہا شنیدہ باشد و دل اندیشہ باشد کہ خود را بگریختن از ہنگامہ بدر برد و پس و زاویۂ گمنامی کہ ہمسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد از انجا کہ سلاح و سلب نداشت سراسیمہ از جا رفت و آخرگاہ بدر آمدہ بجنگ سیلی و مشت رہ گریز پیش گرفت خون خواہاں بخوں گرمی در وے آویختند، و خویش را کہ بدلیل گرم شدہ بود گرما گرم بر زمیں ریختند.

نوائے ندیم کہ مانی نہ تازہ دوئی خویش — لبسزہ کہ سر از طرف جوئبار کشد
فریب جہد کہ دوں مخور کہ ایں ابجہر — دمِ فشار کسی را کہ در کنار کشد
ہوائے تاج شہی ہر کرا بود در سر — سرے بہ دعوی شاہان تاجدار کشد

احوال ہمایوں و شیر شاہ

شیر خاں را دل دگر بود و زباں دگر، بہ لابہ گری و فسون گستری پیام آشتی در میان داشت تا چناں شد کہ ہیچکس را ستیزہ و رااندیشہ نگزاشتہ از آں گل ربیعے کہ در راہ پیمودہ بودند، و در آں شب از رہروی لے نے از شادی تیاسودہ بودند، پیادہ آزردہ پائے بود و سوار فرسودہ اندام و ستور پشت ریش. فریب دوستی از دشمن خوردگاں (یعنی ہمایوں و لشکریانش کہ فریب از شیر شاہ خوردہ بودند) دست از غارت و تاراج غنیم کشیدند و دم آسائش غنیمت شمردند. پا پیادہ جادہ زہ دامن آشنا شد. (یعنی پا بدامن کشیدہ بخواب رفتند) و پیکرہا چوں صورت در بابستر پیوند پذیرفت. سر از بالش نکلی خیزد تا کلاہ و مغفر را چہ کنند، و پیراہن حریر بر تن گراں ست تا حلقہ و جوشن کجا بند. ہوا نمناک بود. و ابر رشحہ فشاں، تیغ در نیام زنگ بست و نمد زیں بر بارگی گراں گشت. سپیدہ دمے کہ تیرگی تار تیغ جہاں را فرہ گرفتہ بود ہنگامہ سازان ہنگامہ جوئے یکسرہ بر غنودگاں ریختند، شگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفہ برہمی ـــ در لشکر افتادہ کلاہ از سر رد پا، وہم از افغاں نشناختہ از تخت خواب جستہ بے زیں نشستہ، پراگندہ ہر طرف تاختند گروہے. "تیر جہادا باد" گویاں سوارہ خود را بدریا زدند. و ہنروئے چند سال جویاں بہ شنا دست و پا زدند. تا کداماں بزخم دم تیغ و کداماں بہ خم موج در مردہ باشند، و کداماں از طوفانِ ایں ـــ دو آب (یعنی آب تیغ و آب رود) جاں بسلامت بردہ باشند. شہنشاہ بحر و بر (ہمایوں) نہنگ دشت نورد و دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فراز ساحل در آب افگند. پائے از رکاب، و عناں از دست و اسپ از خم ران بدر رفت و شاہ سوارے کہ شاہاں ہنگام سواری بوسہ بر رکابش می زدند غوطہ در آب خورد و نظام نام آزادہ از آب کشاں لشکر کہ پنہاں از خویش اقبال را چشم براہ و گوش بصدا داشت (یعنی بے آنکہ خبر داشتہ باشد منتظر عروج و اقبال خود بود) و با خویشتن دریں اندیشہ کہ از ساحل چوں گذرد بر ساحل جا داشت ہوا خواہانہ بداں چستی کہ گوئی گوئے دولت برد خود را بآب در زد بارے بدانست آشکارا جہاں سقائے سخت کمشے بودہ بہ دالا دید معنی آشنایاں فرخ سروشے بود کہ جہانیاں را از گرداب بدر آورد و بہ جہانیاں منت نہاد.

از دستنبو

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی لفظ بہت کم آتے ہیں لیکن کتاب دستنبو میں جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے. التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے. باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبو میں اپنی طرزِ خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا. چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبو کے چند فقرے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں.

دریں روزگار، کہ بہرِ زمزمہ را ہنجار دہر بہر دار رفتار دہر کجا سپاہے بو واز پہلو سخن پیوی بگزار دبگوے کہ خود روز و روزگار برگشت اختر شناسانِ سپہر پیمائے (یعنی منجماں) بر آنند کہ دراں روزگار کہ بزم تاریز وجود شہریار پارس کہ از نہ کا زتازیاں (اہلِ عرب) بہم خورد کیواں (زحل) و بہرام (مریخ) در خرچنگ (برج سرطان) انجمن آرائے و ہمراز ماہ بودند. اینک ہماں پایہ (درجہ) سیزدہم از خرچنگ ہمچناں بہم پیوستن گاہِ (قِران) بہرام (کیوان) ست و ایں شورش رہ پرخاش و جنگ و خوازی و خونخواری، و درنگ و نیرنگ، نمایہ (ظہور) آنست.

داناہریں گفتار کہ گردد؟ آں تاختن لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر و ایں لشکر لشکرست. از فرادندان لشکر، چنانکہ از داستان باستان پارسیان پارس بہم نمانستن (عدم مشابہت) ایں دو ستیزہ آویز جدائی سوادارد. درآں بار کہ سخن در کیش بود. ایران ویران بہ فرۂ فرہنگ کیش نو یعنی (اسلام) فرجام آبادی، و از بند آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت. و دریں بار کہ گفتار درہ آئین ست. ہندیاں بہ چہ خم داشت کہ ام آئین تازہ شادماں باشند؟ پارسیاں رخ از آتش تافتند و بسوے خدا راہ یافتند. ہندیاں دامن دادگراں (یعنی اہل فرہنگ) از دست دادند و بشکنجہ وام ہمرہی رہ زناں (درندگاں) افتادند. نمی بینی کہ از دامن تا دام و از داد تا دام چہ مایہ دوری ست، و داد آنست کہ آرامش (راحت) جز در آئین انگریز چشم داشتن کوری ست. زخم تازیانہ تازیاں از خوبی آں کیش فرخ (اسلام) مرہمی داشت روزگار درنوردد ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی اگر میداشت باز اندوہ از دوش دل افتاد نشرند (پریشان و تباہ، بری) داشت. اگر در اندیشہ دانا زدانا بہ ہر دانش دو داد ازیں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست بس نشاں و ہندو بر دل اندوہگیں بیناک سپاس نہند. جہانیاں با جہانباناں ستیزند، و لشکریاں خون لشکر آرایاں ریزند و آنگاہ شادی ورزند و بر خویشتن نازند. ہاں اے دانندگان فرز بود (حکمت الہی) و شناسندگان زیاں و سود ایں ہنگامہ آتش خشم نداوندگرم ست در روز کار زار پارس را ایں چنیں امید سوز و آرزو گداز نہ بود.

• چاشتگاہ دو شنبہ شانزدہم ماہ روزہ و یازدہم مئی سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگہ رفت در دیوار بارہ و بارو ے دہلی بجنبید و آں جنبش زمیں را فرا گرفت. سخن در زمیں لرز (زلزلہ) نمی رود، در آں روز جہاں سوز بخت بر گشتہ و سر گشتہ چند از سپاہ کینہ خواہ میرٹھ بشہر درآمدند ہمہ بے آزرم و شور انگیز و بخون کشتی تشنہ و مفتوں انگریز دیدبانان دروازہ ہائے شہر کہ بودن (علاوہ) از ہم گوہری و ہم پیشگی شگفت (عجب نیست) کہ ہم از پیش ہم سوگند نیز باشند ہم پاس نمک و ہم پاس شہر گذاشتند و مہمانان ناخواندہ یا خواندہ و اگرامی داشتند آں سواران سرگراں سبک جلو (سبک عناں) و پیادگان تند خوے تیز دو چوں در ہاں یافتند و در باناں را مہمان نواز یافتند دیوانہ وار ہر سو شتافتند و ہر کرا از فرماند ہر کجا آرا مشگاہ آں جہاں، یافتند تا از نکشتند و پاک نہ سوختند روی از آں سوی بر نتافتند مشتے گدایاں گوشہ گیر، از بخشش انگریزی توشہ گیر کہ نان ترہ و دوغ می خوردند در شہر و دراز یکدگر پراگندہ جا بجا روزگار بسر می بردند (یعنی رعایائے شہر) ہمہ تیر از تیر ناشناسندگان رنج لار کے درد ست، و نہ خدنگے در شست، اگر راست پرسی ایں مردم ہمہ آبادی کوے و برزن اند و برائے آنکہ بہ آہنگ پیکار دامن بہ کمر زنند بایں ہمہ از آں روکہ راہ آب تیز رو بہ خاشاک نتواں بست، دست از چارہ کوتاہ دیدہ ہر یکے در سرا خویش ماتم نشست. یکے ازاں ماتم زدگاں منم کہ در خانہ خویش بودم، چوں غریو و غوغا شنودم تا از پژوہش دم زدم، دراں مایہ درنگ کہ مژہ بر ہم زدم.

آوازہ مجنوں غلیظ بن صاحب ایجنٹ بہادر و قلعدار در ارگ (قلعہ) در دیدہ سواراں و چاپیے رسیدن پیادگاں در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار بلند گشت ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خون گل اندامان ارغواں زار نشد، و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے برگی ماتم کدہ گلہائے نو بہار نشد. ہاے آں جہاں داراں داد آموز دانش اندوز نکو خوے نکو نام و آہ ازاں خاتونان پری چہرہ نازک اندام با رخے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام، و دریغ آں کودکاں جہاں نادیدہ، کہ در شگفتگی رُخ بر لالہ و گل می خندیدند، و در خوش خرامی بر کبک و تذرو آہو می گرفتند کہ ہمگیاں بگرداب خوں فرو رفتند اگر مرگ بہ بالین ایں کشتگان بمو یہ (بگریہ) نخروشد، و در ایں سوگ سیاہ پوشندہ واست، و اگر سپہر خاک گرد و فرد دیندہ زمین سراسیمہ چوں گرداز جا برخیزد بجاست.

ای نو بہارہ چوں تن بسمل بخوں بغلط — اے روز گار چوں شب بے ماہ تار شو
اے آفتاب روی بہ سیلی کبود کن — اے ماہتاب داغ دل روز گار شو

باہے چو آں روز تیرہ بشام رسیدہ گیتی تاریک تر گردید، سیہ دروناں بخو کش (بخیرگی کشیدہ) ہم در شہر جا بجا رخت تن آساں انداختند و ہم در ارگ باغ خسروی دا آخور اسپاں و نشیمن شاہی را خوابگاہ خویش ساختند رفتہ رفتہ از شہر ہائے دور دست آگہی رسید کہ شوریدگان ہر سپاہ، در ہر فرود آمدن گاہ (منزل) خون سپہداراں ریختہ اند. گروہا گروہ راز سپاہی و کشاورز دل یکے گشت، و ہمہ بے آنکہ باہم سخن درمیان آرند یک دست بر یک کار کمر بستند، و آنگاہ چپاں پر دو دو کمرے و چگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبش جوش خونے کے از کمر گشاد نہ پذیرد پنداری ایں لشکر آہستہ بے مرد جنگ جویان بے شمار را جاروب داد کہ ہندی ست آرے زفت دو دب ہند و بوم بداں ساں کہ آرامش و آسائش اگر چو پند بافدائم ہر کا ہے گاہے نیابند ہمچنیں جاروب گیتی آشوب ہمی خواست اینک ہزار لشکر ہمگی ہمرہے لشکر آرائے آراستہ و بسا سپاہ بینی یکسرہ بے سپہدار بجنگ برخاستہ.

توپ و گولہ و ساچمہ و چہر آد بادرو ہمہ از خانہ انگریز آوردہ و با گنجینہ داراں روے بستیز آوردہ آئیں نبرد و روش پیکار ہمہ از انگریز آموختہ، و در خ کیں آموزگار ماں افروختہ. دل ست سنگ و آہن نیست چرا نہ سوزد چشم ست رخنہ دروزن نیست چوں نگرید؟ آرے ہم بداغ مرگ فرماندہاں باید سوخت، و ہم بر ویرانی ہندوستان باید گریست. شہر ہاے بے شہریار چہ از بندہ ہاے بے خداوند چنانکہ باغہائے بے باغباں پر از درختان نا بہ سزا سندہ ہزن از گیر و دار آزاد و: بازارگاں از تمغا، خانہ ہا ویرانہ ہا و کلبہ ہا (و کاہہا) خوان یغما.

از دیباچۂ ثانی درفش کاویانی

غالب خاکسار ہر زہ کار را از آسمان بزمین فرستادند، و فرماں دادند کہ در پیشہ کشاورزی (کاشتکاری) ورزد و ایں فرماں (فرماں) را بازماں (توقف) نہ پسندد. ناگزیر می بایست (ضرور تھا) کمر بستن و زمیں خستن و گاو راندن و دانہ افشاندن. ناداں (کشاورزی نہ کرد بلکہ) بہوس در زمین غزل جاں کند، و ازاں گہر ہا کہ با خویش آوردہ بود ہمہ داراں زمیں پراگندہ ہا نا (گویا) از ہر دانہ کہ کاشت ہزار دانہ چشم داشت از مرواریدکہ در خاک نہاں کنند. شنیدہ؟ کہ ریشہ سر بہ زند. کاش جو کاشتے تا سود بردا شتے. دانسہ کہ ہمہ را خاک خورد، (یعنی تلف شد ناچار) ہمہ دیگر را پیش نخالہاں روزگار بُرد رید مد و پسندیدہ نخریدند جز باید یکے از زانو داناں پژوہش (پرسش) رفت کہ در مبدار فیاض بخل نیست، ابر بہ باغ و راغ و دشمن و دوست یکساں بارد، چوں است کہ مردم چندے نادار و اندے (یعنی یکسانست) جدا شناس (مابہ الامتیاز) اگر ہست

جز این نیست کہ کار ہا دگر است. زہر یک بریک ورق سوزد و سازد چہ گر سر گردیم) از ہر کس بریک صفحہ نوشتہ اند. آسمان ورق از دفتر با خویش آورد و مندرجات روزی از ہر در کہ معتقد بود برگو ند ایشان از آن رو کہ انفکاک صفحہ از ورق صورت نبست ہمیشہ ہست آمدند ہمی کیسہ زیستند گفتم از چیست؟ کہ در چار سوے دہر ہیچ بخت صلۂ مدح و قبول غزلم نیست

گفت آن از نیست کہ برات (چھٹی یا چک)، بیاوردہ و این از انست کہ بیجا بلند واری، و بہ ناشناسا زمان (یعنی اجنبی زبان) حرف می زنی. گفتم چہ کنم نا ز اندہ باز رہم؟ گفت شکیب ورزد و خون گری، و آنچہ از شیخ علی حزیں شنیدہ می گوے

٥ کس زبان مرا نمی فہمد
بہ عزیزاں چہ التماس کنم

نقشان داد بن اغلاط برہان قاطع سپاس می خواست نہ ستیز، در قلمرو ہندگس نماندہ باشد کہ مرا بدیں نیکی بد نخواندہ باشد یکے خنجر آورد کہ من قاطعم بے قاطع برہانم دگرے اخگر آورد کہ من محرق آنم. کیست تا از من بدان جوان مرداں گوید کہ اندر بدن و سوختن کالبد چہ فغان و خان چہ خیزد "بزہ مند (گناہگار) منم، اگر در آتش فگنند و در بہ تیغ و دیم زنند بہر دو گزند، رو سزاستم (یعنی لائق ہستم) و ہر دو سزا مرا سزا داد.

سخندان راستی جوے را بایستے آنکہ از ہر کتاب فرہنگ عبارت جامع آن را بداں نگاہِ تیز نگرد کہ از بس تیزی در جوہر لفظ فرو رود تا چگونگی پیوند الفاظ کہ انگیزش گاہ معنی ست آشکار شود ہرگاہ آن را ہنجار اہل زبان نہ بینند داند کہ در سودا ے زباندانی جز زیاں نہ بیند.

دگراں را نند وکار آنان، مرا نیز خودے در ولنے دادہ اند. خشم از آزردہ (چھش آوردہ) از لیفۂ بیگانگاں را چون پذیرم؟ و از نیروے خود خدا داد کار چرا نگیرم؟ ہستی بخش را سپاس کہ نیز و فزاے دانش من دانشمند کسی ست کہ اگر چنانکہ راز داں بود. راز گوے نیز بودے ششمیں سامان بہ شمار آمدے.

نہ خویشاں بہ بیگانگی شاد مانم
نمانم بکس چون بکس ہے نمانم
عزیزم و لے ہم رو شناسی عزیزاں
چہار سر افزاز در بوستانم
گر نستم کہ از تخم افراسیابم
گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم؟
دل و دست تیغ آزمائی ندارم
رہ رسم کشور کشائی ندانم
بہ میدان معنی عنان در زختم
بہ ہنجار پہلو زباں پہلوانم
دو سی سال توقیع معنی نوشتم
سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطع برہان کہ صنعت نقشبندِ خیال من ست، نہ نامۂ اعمال من ست کہ در آں جہاں تن خواہند سپرد. ہم دریں جہاں خواہد ماند. در دل فرود آمد کہ بمقابلے چند کلامے چند بفزایم و ایں مجموعہ را کہ قاطع برہان نام نہادہ ام پس درفش کاویانی خطاب دہم.

نازم بہ خرام کلک و طرز رقمش
ما ناست ز تیزی بدم تیغ دمش
چوں اسم کتاب قاطع برہاں بود
گردید درفش کاویانی نامش

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم سرودن سخنہائے دیرینہ استغفار، جز افزودن ہوش انگیزہ (سبب و باعث) ندارد یاراں جفا کنند و من بہ ازاے ہر جفا (بعوض ہر جفا)، وفا ورزم ہلا نکوئی و ہمی سنگ زنند و گہر بارم.

از تقریظات و دیباچہ ہاے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں۔ ان میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے شاعری کا عنصر نظم کے مراتب غالب تر پایا جاتا ہے۔ ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں فقروں اور ان کے اجزا میں عموماً ایک خاص قسم کا وزن اور تول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں، اکثر جگہ صفات متوالیہ و متتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ بس سوا اس کے کہ یہ نثر میں شعر کے اوزان مخصوص سے، جن کو اس کی ماہیت میں کچھ دخل نہیں، معرا ہیں۔ ہر ایک اعتبار سے ان پر شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے۔

چونکہ یہ نثریں مرزا نے خاص کر اپنے عالی دماغ نکتہ سنج معاصرین کی ضیافت طبع کے لیے لکھی ہیں اور ان میں اپنی نو آئین طرازی اور نادرہ سنجی کا جیسا کہ چاہیے حق ادا کیا ہے۔ اس لیے جب تک کہ ان کے ایک ایک فقرہ کی شرح نہ کی جائے عام ناظرین ان سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائے گا۔ جس کی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزرے گا۔ لہٰذا ان نثروں میں سے صرف اس قدر انتخاب کیا جائے گا۔ جس سے مرزا کی ان جزیل اور گراں مایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

اس غرض کے لیے ہم اول بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھ کر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب پنج آہنگ کا دوسرا آہنگ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں؛ اس کے اول میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے اور سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

وہاں ایک جگہ مضمون مذکور کی نسبت لکھتے ہیں، "زہے شور کہ چوں ذوق مے در طینت زاید ہیچ گلبن را دو آبیاری شہ خاک نہ درود. و خار کہ نا استوار کہ ہر دیوار کہ درداں ریگستان برگشتند پیش از سایۂ خود بخاک افتد."

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ دیوان مذکور اور اس کے مواد افکار میں آورد اور تصنع یا کسی استاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے۔ اس طرح ادا کرتے ہیں: "بنا بر و (یعنی چشم بد دور) تحسین نگاہے ست از روے شاہد ہر صفت گردہ معنی بجنبش نسیم بر افتادہ، یعنی ننگ کشاکش دست ناکشیدہ، باز پسیں چراغیست از گرامی چراغاں نیم سوختہ پہلو رخ با فروختن دادہ یعنی داغ منت خس نادیدہ۔"

ایک جگہ اس مطلب کو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اس کے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا۔ اس طرح بیان کرتے ہیں: "سخن آفریں خداے گیتی آرائے را ستایم کہ تا خانۂ ضمیر را از فراوانی رنگا رنگ معنی بہ لعل و گہر انباشتہ بازو یم را ترازوئی مرجان سنجی و خامہ ام را ہنگامہ گہر پاشی ارزانی داشت"۔ اب ہم کچھ عبارتیں دیباچوں اور

تقریظوں سے انتخاب کر کے ہدیہ ناظرین با تمکین کرتے ہیں۔

دیوان فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو، کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھ کر میرے حسن بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "اے خم میخانہ سرمدی نسبت ناچشیدگاں سگالند کہ، ہیچمدانی را این مایہ سیرابی نطق از کجا است، غافل کہ نم و شحر یک فیض ست کہ سبزہ را دمیدن و نہال را سر کشیدن، و میوہ را رسیدن و لب را زمزمہ آفریدن آموخت و بہ پرتو ہنجار ازلی ہدایت شبگیر نوردگاں اندیشند کہ تیرہ سرانجامے را این ہمہ روشنائی گفتار چراست، بیخبر کہ فروغ تابش یک نور ست کہ شمع را بشعلہ، و قدح را بہ بادہ و گل را بہ رنگ و دم را بسخن برافروخت۔

داغم از کوتہ نظراں تنگ چشم کہ دمیدن تازہ گل از گیاہ و درخشیدن برق بہ شبہائے سیاہ شگفت شمارند و جنبیدن زبانہائے گویا بہ سخن ہائے نغز و شغوار انگارند غنچہ مشکیں نفس است، و باد غالیہ سائے، و گل کشادہ و بلبل نوا سنج، زباں چربی چکیدہ است کہ سخن سرائے نباشد مہر جلوہ برتابد و ذرہ بے تابی، و بحر روانی، و قطرۂ تسنیم، دل را کہ گفتہ است کہ از شورش ستوہ آید۔ ہمانا بدالست این گروہ و بادہ در خمخانۂ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفان گذشتہ را تردماغ ساختہ، حالیا بساط بزم سخن برچیدہ و جام سبو بر سر ہم شکستہ و از اں قلزم قلزم رواق نمے بر جائے نماندہ، پندارند، کاش بانجمنے کہ من در فروردین روہ (یعنی صحت پاش) بحلقۂ اوباش قدح می گیرم ۔فرارسند تا دارسند کہ مے فراوان ست، و ساقی بید ریغ بخش، و پیمانہ ہا جرعہ ریز ست و لبہائے العطش گوئے۔ و للّٰہ درّ من قال۔

هنوز آں ابر رحمت در فشان ست مے و میخانہ با مہر و نشان ست

اے دے صہبائے سخن بہ روزگار من از کہنگی تند و پر زور ست، و شب اندیشہ را بہ فروغ دمیدن سپیدۂ سحری برات فراوانی نور ست۔ ہر آئینہ رفتگاں سرخوش خنودہ اند، و من خرابِ تم، ہیچیاں چراغاں بودہ اند و من آفتابیم۔

اس کے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کر کے اس طرح لکھتے ہیں۔ "انصاف بالائے طاعت ست، در ہوائے کہ بال بالا خوانی، (یعنی خورستائی) دہ ام و در ادائے کہ غرور را بہ شگرفی ستودہ ام نیز از آں شاہد بازاری ست۔ یعنی ہر ستی دیگر تو انگرستائی (یعنی بادخوانی) بیداد بیں کہ ہر جا لبشانہ غمے از زلف مغولہ گویاں کشودہ شود بلا در من آویزد، تا دل نہ بیچاک آں خمکن بندے و خواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے برادرنگ سروری کج نشیند۔ ہوس مرا بر ایجز د تا بہ پیشش بندہ وار راست استے۔ شادم از آزادی کہ لبا سخن بہ ہنجار عشق بازاں گذاردستم، و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردار دنیا طلباں در مدح اہل جاہ سیاہ کردستم۔ دریغا کہ عمر بیک سیر لختے بچامہ و چنگ سرآمد و پارۂ بدر دریغ و دریغ رفت۔ فرجام گراں خوابی بر تنہاست، و آشوب ہوشائی فرو نشست۔

خاتمہ دیوان فارسی

خاتمہ دیوان فارسی میں اس بات کا عذر، کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اس کے چھپوانے کی نوبت پہنچی اس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خود سرا و بلند پرواز تھی اس کی روک تھام میں بہت سا زمانہ گذر گیا اور اس مطلب کو اپنے طرز خاص میں یوں ادا کرتے ہیں۔

"ہاں و ہاں رخشے بداں توسنی کہ عنانش بوئے و مشامش بوے بر نتافتے۔ و از تموکی (سرکشی) لگام بہ دندانی تنہادہ جز بہ پیمانہ نتافتے از تر سندہ و لے عنانش کشیدہ و بہ بالا آہ از بوس اش آرمیدہ داشتے۔ چوں پارہ از راہ پدیگونہ، کہ بہ غمرودم، بریدہ شد، و روز بلند گشت، و ہم جوش تندی توسن فرونشست، و ہم دست و پائے سوار از عنان و رکاب خستگی پذیر آمد، تاب مہر نیمروز مغز و سر سوار گداختن و تفتگی ریگ بیاباں نعل و پای تگاور نرم کرد۔ رائض را دم رکرہ را قدم بگذار آمد، ہم آں بہ آخر گرائیدہ و ہم این را بہ بستر ـــــــ نیاز آمد۔ توانائی بہ چارہ سگالی توسنی سر آمد، و در ہنگام گستہ دلی خستگی روی آورد۔

کیست تا از من بپرسد؟ اگر نا پرسیدہ گویم در دلیش فرود آید کہ درین سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزہا (یعنی جنگہا) روی دادہ و پس از انکہ کار بدانجامید کہ ہمہ گرا از کوفتگی فرد ماندہ ما ہنجی گہری توفیق بکدام قرار داد آشتی اتفاق افتادہ خامہ دیر جنبش بود، و شوق زودگرائے (جلد باز) گفتار از ہیبت دوری باش اندیشہ بر در از نامے فاصلہ دل و زباں خوں شد، و اگر ناگہ از دل بر زباں رسید، و الا نبسیجی آمد انجا رہ نہ سپرد۔ ہر چند منش (طبیعت) کہ یزدانی سرورش ست در سر آغاز نیز گزیدہ گوئے و پسندیدہ جوئے بود۔ اما پیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزادروی پے جادہ نشناساں برداشتے، و گشی رفتار آناں را النغزش مستانہ انگاشتے تا ہمدلاں نگاہ پو پیش خراماں را بجستگی اندیش ہمقدمی (یعنی لیاقت ہمراہی خویش) کہ در من یافتند۔ مہر بجنبید و دل از آزرم (مروت) بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیہائے من خوردند، و آموزگارانہ در من نگرستند۔ شیخ علی حزیں بخندۂ زیرلبی بے راہہ رویہائے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے نا روا در پائے رہ پیمائے من بسوخت ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس (تاثیر کلام) حرزے بہ بازوے و توشہ بکمر بست، و نظیری لاابالی خرام بہنجار خاصہ خودم بچالش (رفتار) آورد۔"

از دیباچہ دیوان تفتہ

دیوان تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاط قویٰ اور اپنے قلب ماہیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں "ہاں اے غالب تیرہ روز زمزم اختر! کہ بدیں ہستی و کسالت (تخفیت) کہ تراست۔ بداں مانی کہ دانی رہ عالم فرمن محال پسندے دیدہ ایم بہ آتش آرمیدہ انّا اللّٰہ چہ مایہ جوش سوداست (یعنی غلبہ مادۂ سودا) کہ سر نفیکری کشی چوں خطے کہ از نقطہ برآورند ہم ہر رنگ سویدا است۔ آں قلم و اندیشہ کہ از روانی خامہ روانی گفتار آب و ہوا داشت، و ے ہش فا فروردین پرستار بود، و چاشنگہش را نیم سحری پیشکار بدیں ناخوشی و نشر مندی ویراں چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ چمیدن دل از دست تماشائیاں نبرد، و غنچہ را چہ روی داد کہ بہ دمیدن پردہ شکیب نظارگیاں ندرد۔

آں اثر پردہ سازت چہ شد زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد

آں زجنوں پردہ کشائیت کو واں نگر جلوہ پسندت نجات

گفتی (یعنی در جواب گفتش) کہ سوز غم دود از دل برآورد و گداز نفس آذر در زباں زد، بادے کہ ہر آئینہ نہ گداخت، و بازبانے کہ ہمانا نسوخت غدر غمر وگی مسموعیت بیا تا ہمیں دل بہ زہرۂ الحذر لوائے زا بہ سخن نہیم و ہمیں زبان کشر کتمہ این المغز سر لسے را بہ گفتار آریم (یعنی طوعاً و کرہاً تقریظ دیوان تفتہ بر نگاریم)

ز من جز بے دربہ نگوز لیستن جگر خوردن و تازہ رو زیستن

سمن چیدن و در رہ انداختن   دل افسردن و در چہ انداختن۔

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکہ بر ہمگناں اظہار خوشحالی می کنم و از دہ دروں را کہ دل افسردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم تا بر ہیچکس ظاہر نہ شود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خوں   بہ شوراب شستن ز رخسارہ خوں
شگفتن ز داغے کہ بر دل بود   نہفتن شرارے کہ در دل بود

ستایش سخن چشم بد دور۔ خمکدہ سخن را شرابے ست پرزور کہ زمیں ازاں بہ لاے (یعنی بدروے) و سپہر ازاں بہ بوے آں چناں بہ رقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود از دیوار و مشتری را عمامہ از فرق فرو افتد، شگفت نہ نماید۔

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر فارسی کا سب سے بڑا حصہ ان کے مکاتبات و مراسلات ہیں جن میں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں۔ اسی لیے ہم اس حصہ میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کریں گے اور جہاں تک ہو سکے گا۔ مشکل فقروں اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائے گا۔ اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

مرزا علی بخش خاں فیروز پور جھرکے میں ہیں، نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کی جگہ شمس الدین خاں مسند نشین ہوئے ہیں۔ مرزا نے علی بخش خاں کو کلکتہ پہونچ کر خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:۔

"میر فضل مولے خاں نام یارے داشتم، او در انا گرفت (ناگاہ) در عرض راہ بہ مرشد آباد یافتم و در نورد گفتگو ہاے دیرس جو یاے کہ رفت۔ از جا بہ گذاشتن (یعنی از مردن) فخر الدولہ بہادر یم خبر داد، و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں بر گفتند آوخ! اگر چراغ روشن ایں دودمانے مردہ شبستان آرزو ہا تیرہ و تار شد از جانب شما اندیشہ کم دارم کہ اگرچہ شمار ایش آید دلخواہ نباشد۔ ناکساں را دو زبازار خواہد بود و فرومایگاں را گرمی ہنگامہ۔ زود اگر انجمن از ہم پاشد، و پراگندہ چند گرد آیند۔ دولت روے گرداند! و آسودگی بر خیزد زنہار ہوشمندی را کار باید بست ہموارہ بخود نگراں باید بود۔"

ایک اور خط کو جو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"سجان برادر! سخن را از فراوانی بر روے ہم افتادن ست و گرہ در گرہ گردیدن۔ و من آں می خواہم کہ اندک گویم و سود بسیار رود، و شنوندہ آں را از رو در باید۔ و ایں نہ ہیچ (قصد) روائی پذیر نیست مگر آنکہ گویندہ دراں کوشد کہ بخشش از گفتن آں مایہ رود تر نہ رود کہ سر ایں ہر دو رشتہ با ہم گر تواں تافت، بہ نقش یکے در آئینہ دیگرے تواں یافت۔ زمانے گوش بمن دارید و فرا رسید کہ چہ می گویم، و ازیں گفتن چہ می خواہم، و شمارا در برابر آں چہ می باید کرد، و اندازہ آں بایست تا کجا ست۔"

اس کے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کیے ہیں۔

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسۂ اکبر آباد جو مرزا کے ہم وطن ہیں اور انہوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے۔ ان کے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔

امروز شرارۂ بد آتشم زدہ اند   نشتر برگ صبر و فراغم زدہ اند
از کثرت شور عطسہ مغزم ریش ست   تا عطسہ بہ خندہ بر دماغم زدہ اند

جنبش خامہ عیسوی ہنگامۂ مطالع کرتم مخدوم اعظم را نازم کہ با حیاے ہوس ہاے مردہ ساخت خاطر را عرصۂ محشر ساخت و بازار۔ ستیز گرم کرد خار دیریں آرزو ہا سر از دل بر آورد۔ بیاد آمد کہ مرا ہم در گیتی دمے دار مہربانان انجمنے بودہ است چوں خشتر پرسش بمغز اندیشہ فرو بردہ اند ایں ہمہ احوال پرسیدہ اند خونچکانی نواہا تماشا کردنی ست۔ و سازی زدن فراق کہ بجان مخدوم شانزدہ سال است و بدانست نامہ نگارم از بیست سال نیست مرتیز کہ سکے بودہ است کہ نقش آسائش از صفحۂ خاطر بداں ستردہ اند۔ آغاز دو رو بہ دہلی کردم بادہ غفلتے بہ قدح داشتم (یعنی بقیۂ ہوا و ہوس در سر بود) لختے از عمر بہ پیمودن جادۂ کامرانی ہوس گذشت و بے راہہ فرا میدہ شد۔ تا سر از مستی بگردید (یعنی بدمستی سے پھر گیا) و اندراں بے خودی پاے معطلہ پیما بہ گوے فرو رفت۔ (گڑھے میں اتر گیا۔ یعنے ایک ایسا صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہو گئے) لاجرم در ہم شکستہ سراپاے و گرانندہ سرورے، برخاستم۔ ہنگامۂ دیوانگی برادر یکطرف، و غوغاے دام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس را در لب، و نگاہ در دو دیدہ چشم فراموش کرد، و گیتی بدیں روشنی روشن در نظر تیرہ و تار شد۔ بارے از سخن دوختہ و چشمے از خویش فرو بستہ جہاں جہاں شکستگی و عالم عالم خستگی، یا خود گرفتم و از بیداد روزگار نالاں و سینہ بردم تیغ ماراں بکلکتہ رسیدم قرباں وہاں سرسبزی دکو بلندی (یعنی مہربانی و شگفت، کہ روے دل را ہیر دبخشیدند آں ہمہ بخشائش کو مشاہدہ رفت، امید کش آورد، و ذوق آوارگی و ہواے بیاباں مرگی کہ مرا از دہلی بدر آوردہ بود، بدل نماند و ہوس آتشکدہ ہاے یزد و میخانہ ہاے شیراز کہ دل را بسوے خود کشیدند را براہ می خواند، از ضمیر بدر جست (یعنی بمشاہدہ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت) دو سال در آں بقعہ مجاور بودم، چوں گورنر جنرل آہنگ ہندوستان کرد چیشہ بیش در پدرم و بہ دہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، و کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت۔ اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بیاد دادہ و دل بمرگ ناگاہ نہادہ بکنجے نشستہ ام، و در آمیزش بروی بیگانہ و آشنا بستہ ام۔ اگر با اینہمہ رنج و اندوہ، کہ پارۂ ازاں باز گفتم، در نگارش نامہ و پارش پیام کاہل قلم و کوتاہ دم باشم، و بزرگان وطن بیاد نیاوردم، در عالم انصاف بزہ نیستم۔ اما گرانمایگان جہان مہر و وفا کہ از دور افتادگان بپرسند و از مرگ و حیات دوستاں باز بجویند اگر گفتگو بمیاں آید و سمند شکوہ عناں برعناں (یعنی بمقابلہ یکدگر) تازد گوے دعوی بچوگان نخواہند برد و قطع نظر از حریف آب ربوداں۔ (یعنی حریف مغلوب) کہ منم۔ خداے توانا را چہ جواب خواہند داد۔"

کس از اہل وطن غمخوار من نیست   مرا در دہر پنداری وطن نیست

مولوی نور الحسن نامی ایک نوجوان نے کلکتہ سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اس کے ساتھ نثر کا ایک مسودہ اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ اس کے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں۔

"چہ پدید آمد کہ خاطر خاطر را بجانب نثر گراییدے، و ہنگامہ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در آنجا (در کلکتہ) آرائشی ہست۔ بارے ہم دل بر پسندیدہ شعلے نہادہ آید، و ہم اندریں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید۔ دم سردی شما (یعنی کم شوخی شما) بدانش آموزی، اگرچہ دیروز (یعنی در زمانہ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام یاد می کنم، و خون گرمی

(یعنی سرگرمی شما) درخود اندر رای آنچہ امروز می نگرم خود را بدیں شادی کنم، ہمانا در اندیشہ ہائے برگزیدہ دادم بداں ذوری کہ ثمر از شاخ افتد نگفتہ شدہ، در طبع باد آوردہ سنے نے بہ ہنگامہ یوسفی در نظر دادم بداں خوبی کہ دل از فرشتہ رباید از بند حجاب بدر آمدہ، دہر صفت کردہ خواستہ آیدکہ مسودۂ نثر دو سہ ماہہ بمن فرستید ومن آں نگارستہ بادنشست ہر کرشمہ و انگیز ہر بزلہ را بپایستگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحب من! اگر ندانستہ اید کہ گفتار جز بگفتار سرہ نہ گردد، وسخن جز بہ سخن شناختہ نشود ہرچند ارادت شما ذریعۂ سعادت من و خرسندی شما موجب رضامندی من ست، لیکن تحریر در میاں نگنجد بہ میانجی گری خامہ کار بر نیاید۔ آرے نگارش یکدست ست وگفتار لخت لخت۔ ستردن یک لفظ از میانہ، و آوردن لفظ دیگر بجاے آں آبرو فشانہ دانا شناسدکہ چہ مایہ گفتگو وچہ قدر پرس و جو د آرد حق ایں پرسش نتواں گذارد مگر بہ زبانی۔ و دریں نزدیک یکے از برادراں، کہ در برادراں از وے عزیز ترے نیست۔ سخنہاے پراگندۂ مرا کہ عبارت از نثر ست گردہ آوردہ و صورت سفینہ دادہ است۔ زیں پس آں مجموعۂ پریشانی را بپیش شما می فرستم تا دستمایۂ سگالش در سخن و باز نمائندہ اندازہ نکوئی فن تواند بود۔

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم نے (جبکہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے) مرزا کو خط لکھا ہے اور اس میں ان کی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے۔ اپنے نتائج افکار میں سے کچھ ان کو بھیجا ہے۔ اور ان سے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں درخواست کی ہے۔ مرزا نے اس کے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے اس میں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں:

"سواد کاشم در کشادہ بود، در رنگ رنگ متاع سخن بروے ہم نہادہ کس از مشتریان حلقہ بر در نزد، و سوداے خریداری از ہیچ دل سر بر نہ زد۔ چوں دکان کالا، و زباں را حرفہاے جگر آلا (یعنی آلودہ بخون جگر) نماند۔ روزگار گرانی پہ فریدے (یعنی نواب مصطفےٰ خاں) پدید آورد کہ نقد رائج سخن خود را بہ بہاے گفتار نا سرۂ من می دہد) و گوہر را بپاے پشیز بہائگی عرضہ می نہد۔

ہاں ہاں اے خریدار دکان بے رونق! از فراوانی مسرت، ورود مسعود ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا با آنکہ نکوئی نشوا و خویشم، بر من بہ رنگ آوردہ صلۂ مرا کہ در سودۂ غمہاے رہرم گنجائی ایں مایہ شادی کو؟ و اندیشہ مرا کہ دل شکستہ رو رباش مار انم، فرجام پذیرائی ایں ہمہ قبول کجا؟ ـــــ زنگارہ را آزادہ و خویش ہگر نہ پشیماں گیرے کہ ایں چنیں شادی را بجز در پذیرے و دستاں آگی قدر ناشناس پندارے کہ از شما ایں قدر ستائش در بارۂ خویش باور دارے جا کہ نہ آساں ست ستودہ شدن بہ زبان شیوہ بیاناں (یعنی فصحا) و دشوار تر ازاں ست اندازہ شناسی یا ندازۂ ستودہ آناں۔

قبلہ مرد چہل سالہ جگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و بہ فرق فرقدان سائے افشاندم (یعنی مجموعۂ نظم فارسی) اکنوں آیم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست گوئی پس از سفتن آں گنج گہرداں رفتہ و از سخن ہر چہ از ازل آوردہ بودم گم شد..."

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم نے تذکرۂ گلشن بیخار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے۔ اس کو دیکھ کر مرزا نے نواب صاحب کو یہ خط لکھا ہے۔ "من کہ زبانم در ستائش بیغراست و اندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ امید کہ دراں پایہ بزمرۂ خوشامد گویاں شمردہ نشوم۔ و بدیں مایہ جرأت بزہ مند نگردم۔ بنا میزد (چشم بد دور) تذکرۂ ترتیب یافتہ مجموعہ فراہم آمد کہ پیش طاق بلند نامی را نقش ونگار است، و نہال نکو سرانجامی را برگ و بار و ہر فوقکر چوں بہ پیداے کنارہ ناپیداے ذوق سخن گام تماشا بہ دارد۔ توشہ برایں بر کمر نتواند بست۔ خضر را آں ہمہ جگر تشنگی کہ سکندر را داشت۔ جبش بر تہ آبے تر توانست کرد۔ و آں آب از دریا بجنبیدن بود۔ شما گر دہے را از دور و نزدیک بہ سخن زندگانی جاوید بخشید ید و ایں لختے از عمر بکار دیگراں کردن ست۔ جاوداں زندہ باشید کہ سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند۔ و ہمگناں بنکوئی نام بر آمد۔ بارے گہر نہ سفتن خامہ و گوہر بر نہ گشتن نامہ در ودیعت الف بہ نگارش اشعار پروین شاد حضرت آزردہ از چہ روست؟ ہر چند ذکر قدام بر جبیں مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد لیکن اگر بہ اقتضاے فرط محبت جراتے بکار می رفت گناہے نہ بود، در تلافی آں بہ پوزش (عذر) نیاز نمی ـــــ افتاد۔"

حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرزا سے جبکہ وہ کلکتہ میں مقیم ہیں خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:

"دوست نوازا! نسیم درود شکیں رقم نامہ غنچۂ ایں راز را پردہ کشاے و شمیم ایں نوید را غالیہ ساے آمد کہ روزگار بر گزلک تطاول زماں فراق نقش بے اعتباری ہاے مرا از یاد عزیزاں نستردہ است۔

در معرض طلب نثر فردمانده تر از اں میزبان بے دستگاہم کہ ناگرفت (اچانک) مہمانے عزیز مش از راہ دور در رسد، و بے چارہ لب بگرد سرایاے سرمایۂ خویشتن بگردد۔ تا شورباے دو و چمچہ و نان کشکینے (یعنی نان جویں) فراز آرد۔ من والیاں من کو جگر دا آوردن نثر پراگندہ نپرداختہ و خود را در ایں کشاکش نینداختہ ام۔ چہ پیدا است کہ فرد ریختۂ کلک ایں کس (یعنی من) لختے ست نثر ند (یعنی زشت) یا رحمی ست فرہمند (یعنی خوب) در صورت اول چہ لازم ست خود را بہیچ فروختن و دوبال نظارہ آئینہ گاں پسمر خریدن، و در شق ثانی اندیشہ می سنجد کہ رفتگاں چہ بردہ اند گذشتگاں چہ یافتہ کہ ما را از روے آں داید (یعنی دیوزہ) بیتاب دارد۔ الصاف بالاے طاعت است بہ خوی گاہے کہ تو را ناز سمتین و العزہ بید گی فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگی ذوق مسلم داشتہ) و لواے قرۃ العین و اقف بگیرد اثی شیوہ (یعنی یکجی طرز بر افراشتہ باشند) باکہ باید گفت کہ نتائج طبع ما کجائی ست، و مارا چہ لذت دریں جگر خالی ست سطرے چند کہ بہ دیباچگی دیوان ریختہ کسوت حرف در رقم پوشیدہ، و دو دو سو دا ئے کہ بہ آرائش سفینہ موسوم بہ گل رعنا از سویدا جوشیدہ است ارمغان می آرم وا ز شرم تنگ مائگی آب می گردم۔ والسلام۔"

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسیٰ جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں: "دریں ہنگام فرو ماندگی از اندازہ گذشتہ و دل بہ افسردگی خوی گرفتہ است۔ نہ آنم چہ می نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگریستن ثمر از تازہ بدیدہ و در می گنجد، و دریں نگارش نام از شادی در جاں (بہر انگشت) می رقصد۔ بخت را بہ رسائی ستایم و پندارم کہ بجلوۂ معنی رسیدہ ام۔ خود را بجراں مائگی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ بہ ایادیہ بیضا دیدہ ام۔ اگر محذور مرا بگرفتن عیار ایں دعویٰ حیرتے روے دہد، و ایں مایہ ہالاخوانی و خود نمائی از من عجب آید۔ گویم ہاں انصاف۔ سخن بکنایہ می سرایم نہ بگزاف موسیٰ اشارہ بہ سیدی کہ می میر موسیٰ جان ست، و ید بیضا عبارت از دیوان فرد خالی عنواں۔"

نہ بے دیوان کہ مدامش از دودۂ چراغ طور ست۔ و غلافش از دیباۓ گلکاری قلزم معنی را سفینہ است، و جواہر مضمون را گنجینہ ۔۔۔۔

سبحان اللہ سخن بہ روزگار مخدوم بہ پایہ بلند رسید، و اردو در اردو فن دیگر پدید آمد۔ اینکہ نارسیدن نامہ من بخاطر جاے گرفت و شکوۂ آں بہ زبان قلم رفت، مرا آبرو افزود، و ارزش مرا در نظر جلوہ گر ساخت تو شامن کہ دران چشم و دلم جاے باشد، اگر چوں نامۂ من نہ رسد یار نزوار ندر گرد سر ایں نوازش گردم، و دریں پرسش حال بر افتخارم۔"

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعہ خط موسومہ لالہ ہیرالال کے معلوم ہوئی ہے۔ اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں :۔

"قبلہ و کعبہ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرالال را ہواے دیدن عنقا و سر دو ناگاہ شامگاہے بہ نشیمن تنہائی من گذر افتادے۔ آں دو گرفتن آتش گرہ۔ اگر دوالا کاشانہ و سوختن خانہ و رخت ہمسایگان از ہر کرانہ، وز رسیدن آں بے بلا زمان و، آں میانہ، از کجا شنودمے۔ و اگر نشنودمے ہر آئینہ، ہم حق دوستانہ پرسش کہ شیوۂ غمگساری و انداز دلہائی است۔ ناگذاردہ ماندمے وہم ایں دی نیایش کہ لازمہ حق شناسی و سپاسگزاری است بتقدیم نرسیدمے۔ ہاں اے وفا دشمن! بیگانگان (یعنی لالہ ہیرالال) کامیاب پیام نامہ سوز آشنایاں جگر تشنۂ رشحہ خامہ!

وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید ۔۔۔ نامۂ واشدہ مہر بہ عنواں زدہ

ہماناں سوزندہ آذر سرگرمی شوق از بن فرا گرفتہ بود کہ بیتابانہ گرد سر گردیدہ واندر آں از تشتم (شدت) زبانہ و شرارہ در خویشتن نگہداشت ہیہات من کجا و ایں ہمہ دعوی بلند از کجا یا خود ہمانی ہاے گماں تاثیر مہر و فاست کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لاے و یاوہ سراے دارد، ورنہ آنرا کہ از شعلہ آہ جگر سوختگان دامن نسوزد عجب نیست اگر آتش افروختہ پیرامن نہ سوزد۔ شکوہ بیش کش و پیغارہ (طعنہ) بر طرف فداے توانائی شکر گوئیم کہ بلاے بے زینہار را از بندگان خویش بگرداند و تابے بحران را دید۔ و دیدہ وراں را سر بدست افتہ۔ کہ شرر تیز روے جبرئیل بو معجزہ آسودگی خلیل اللہ در نظر ہا تازہ کردہ ۔۔۔۔۔۔ اگر دانستے کہ پیش خود شرمساری نخواہم کشید۔ و مرا اندریں محال طلبی بر من زبان طعنہ دراز نخواہد شد۔ از آں مخدوم بہ عنایت پاسخ ایں نامہ و تفصیل ایں ہنگامہ در خواستے و پرسیدمے کہ دراں ہنگام آتش زبانہ زدہ، و نگہ بسراغ تیرگی دودے و تابش نمودے فرا رسید۔ شما چہ می کردید؟ و نور چشم مردمی و فرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود؟ و پس از انکہ رستخیز دود ہا آشکار شد، و ہزا ہزور انجمن افتاد۔ سراسیمگی و دو دنی پرستاراں و بیتابی بر منی خواداراں چہ قیامت آورد؟ اینہمہ آشوب نہ ماپہ دیر کشید؟ و سر انجام کار کہ مژدۂ ایمنی داد، مذ بہ کار خانہ کدواپ و بہ سوبار کہاداں (یعنی اسباب ایشاں) کہ ایں بار اجزاے اطراف کاشانہ محل نیست و بیشتر از تیہا طعمۂ آتش بلکہ افروزینہ (ایندھن) آتش ست چہ گذشت؟ لیکن چوں ارزش التفات از من سلب کردہ، و مرا اینک دو دل از دودہ اندر خیالیاں دراں گوشہ خاطرم جاے نماندہ۔ ہر چہ گفتہ ام بطریق آرزو ست نہ بر سبیل سوال۔ والسلام۔"

نواب مصطفٰی خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوق ملاقات اور غزل تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے اس کے اول اور آخر کے فقرے یہ ہیں: "سحرگاہے کہ دلم از دود شانہ چنانکہ مومن جہر پیشہ از رنج ہمسایہ در آزار باشد بیقرار بود، و دستم از انتقام بیتابی دل رعشہ دار، فرخندہ سروشے از در درآمد سپردن نامۂ گل بہ جیب تمنا ریخت ہر چند نامہ سپارس امید اکسیر، و دیدۂ جاں را توتیا آورد، تارک اقبال را افسر از چکیدہ آرزو از پور بخشید، لیکن از انجا کہ آں قدسی مقادمنہ از شعر و غزل ہیچ نام از احوال زاہد از ذکرے و شاہد۔ سادہ بود۔ دل سودا زدہ بداں نیاسود، و خادم بداں یکہ و جرعہ صہبا نشکست گفتم ہے۔ نہ مژدۂ دیدارے کہ دل بر نشاط آں تواں بستن، و نہ کرشمہ سخنے کہ لب بہ زمزمہ آں تواں کشودن ۔۔۔۔۔ امید کہ ازیں بعد نوید مہربانی ہا ناشامی غزل شادم فرمایند، و نوید روی کوتاہی ہادن روز فراق کہ اندریں موسم کہ خسرو انجم بہ اسد جاے دارد عجب نیست بور ہستند و دولت و اقبال روز افزوں باد۔"

جواب نامۂ شیخ امیر اللہ سرور تخلص "رسیدن دلنواز نامہ دل را تنومند شاخ آرزو را برومند ساخت۔ گلہ از نارسیدن پاسخ نامہ ہاے شیخ میکنید واز خدا شرم ندارید، من خود از جانب شما گمانی داشتم کہ کجا یید و چہ در سر دارید بارے پردہ از روے کار شما بر گرفتم۔ و دانستم کہ یکچند مرا فراموش کردہ بودید۔ ناگاہ ورود جناب مولانا تراب علی بداں بقعہ افتاد، شنیدید کہ غالب (یعنی غالب) از سخت جانی ہنوز زندہ است مہر کہن بجنبید، خواستید کہ بنامہ یاد آورید، از راہ گلہ گذشتہ اندیشہ کردید، ناچار دروغے چند بہم بافتید و آں را دیباچہ نامہ ساختید۔ از حال من پرسیدہ آید۔ چہ گوئیم کہ گفتن نیرزد، چنانکہ گفتہ اند۔

شکستہ دل تر از اں ساغر بلورینم ۔۔۔ کہ در میانہ خارا کسی زدور دہا

خیرہ سر و آشفتہ راے۔ نہ زبان سخن سراے و نہ دل از سراسیمگی بہ جاے چہار سال میگذرد کہ مقدمۂ من با جلاس کونسل در پیش است، و دلم از تفرقہ بیم و امید ریش۔ حکمے کہ قطع خصومت تواند کرد بہ نیامدہ رو ہنگام بہ پایاں رسیدن تیرہ شب امید فی در نیامدہ حالیا ماں سرم کہ چوں جزو اعظم کونسل اشرف الامرا لارڈ ڈلہوزی کونڈس بہادر بدیں دیار درآید بداعش در آویزم و داد خواہم، و اشد عاے عدد و حکم اخیر کنم گروہے بر آنند کہ نواب عالی جناب بہ دہلی نخواہد آمد ہم از آں رہگذر ہا بہ اجمیر خواہد رفت۔ اگر ہمچنیں ست بدامن در دور نگادمن، و آوخ از دوری راہ و درازی کار من۔

خواستہ آید کہ نتائج طبع والاے شما بگرم را از تراودیدہ ہاے کام و زبان خود بشمار ارمغانی فرستم فرصت آں کجا، و دماغ ایں کو؟ آمد آمد نواب گورنر، و دریوزۂ اخبار از ہر در، ترتیب افراد مقدمہ و تمہید نگارش حال، سنجیدن اندیشہ ہاے رنگا رنگ، و سگالیدن اندازہ بیان آں ماہ و ستیاری و غمخواری از کسے چشم ندارم کہ چوں ورقے انشا کردہ یا فتم نقل آں تواند برداشت، یا چوں دفترے از ہمہ رنگ چند روز دگر معاف دارید تا از اینکہ بہ نوید گاہ گاہ بہ نامہ زنگ زداے آئینہ وداد باشید۔"

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں۔ ان کو نواب امین الدین خاں مرحوم کے باب میں جبکہ وہ رئیس فیروزپور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے کلکتے گئے ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں :۔

"مخدوم غالب! اگر نہ اندوہ سترگ بند بر دم نہادہ بودے من دانم و دل کہ در شکوہ چہ روش ہا ایجاد دو رگا پر عرجہ ہا بنیاد کردمے مرزا شما (یعنی سود شما)

ورنہ کاہی من ست (جس کے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) دگرنہ اگر تاب و تواں داشتے آں قدر با شما در آویختے کہ شما را دامن و گریباں بزیاں رفتے، و مرا سر و رو شکستے۔ آخر از خدا بترسید و از روئے داد بسنجید کہ کار من و شما بداں رسو کردہ اند ؟ را بگذرد و بہ نامہ یاد نگردم۔ گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) کہ در بند گزارش اندوہے نماندہ ام بشکوہ کجا بجا طرنا شادی رسد اگر چہ اندریں ورق گنجائی ایں دو سطر نیز نہ بود۔ لیکن اندیشہ بداں پیچیدہ کہ مبادا و دست اوا نشناس من مرا از خود خرسند داند و بدیں گمان از تلافی فارغ باشد و من زباں زدۂ جاوید و گسستہ امید باشم۔

بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعائے اصل بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب شفیق نواب امین الدین احمد خان بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ را ہماں موج بلا کہ رہ اہم شکستہ بود (یعنی تعدی رئیس فیروز پور) خانہ بسیلاب فنا داد و خون و فایم بگردن کہ دریں سفر از ہمپایش باز ماندم۔ درماندگی و بیچارگی من از ینجا تواں سنجید کہ دنداں بر جگر نہم، و امین الدین احمد خان را در سفر تنہا گزاردم۔ اگر قاضی محبت بدیں جرم بر نطع نشاند، و بر تیغ بیدریغ خونم ریزد، سزاوارم۔ و لطف دریں ست کہ ہر چند دریں باب نگفتہ دگر ایم و ہنگامہ پوزش آرایم، شرمساری بیشتر گردد و خجلت افزاید۔ مگر سراج الدین احمد خاں بہ تلافی برخیزد تا از گرانی بشکوہ (شرمندگی) سبکدوش گردم و گرد خجلت از چہرہ برافشانم۔ یعنی کمر بہ غمخواری و مہر نوازی استوار بندید، و خود یاد دوست دیرینہ امین الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و سگالش گری بجا آرید کہ ایں دردمند دراز غاماں (یعنی امین الدین خاں) اسد اللہ رو سیاہ را فراموش کند، و شمارا بجای او داند۔ و نیز بہ برادر والا قدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد و شمار او دریابد۔ و داند کہ اسد اللہ پیش از و بہ کلکتہ رسیدہ است قطع نظر ایں مدارج کہ برشمردم۔ آخر خدائے ہست و دادے ہست۔ امشاءِ ناکامی و ستم کشی ایں فرد فرخ ناصیہ سعادت یعنی امین الدین احمد خاں خار در اول بگدازد، و آہن را آب گرداند۔"

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں۔ "گوہر آگین نامۂ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید، و دیدہ و دل را فروغ و فراغ بخشید۔ تا رسیدن نامۂ مرا با خستگی شوقم حمل گردید۔ چرا برگ حمل نہ کردید۔ تا از ادا شناسی ہائے شما خرسند بودے و شما را اہل دل و دانشور شمردے۔ من و ایمان من کہ ہمیشہ مہر شما بہ معزول و دیدہ و محبت شما با جان در آویختہ تا زندہ ام، بندہ ام۔ و فا آئین من ست و مودت دین من ست اگر در نگارش نامہ درنگے روے دہد بر فراموشی محمول نہ شود دردہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر، و تفرقہ ہا در خاطر، و سوداہا در سر، چہ گویم چہ می کشم و روز و شب چگونہ بسر می برم۔"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اسٹرلنگ صاحب فارن سیکرٹری گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں۔ "عمر من و جان من! پس از رسیدن گرامی نامہ در بند آں بودم کہ پاسخ گزار شوم و ماجرائے خود شرح دہم۔ ناگہاں دی کہ روز شنبہ پانزدہم ذی الحجہ بود آوازہ در افتاد کہ مجموعہ مکارم اخلاق را شیرازۂ وجود از ہم گسیخت، شمع ایوان سروری مرد و نہال باغ آگہی را برگ و بار فرو ریخت، و دستگیر درماندگان را دست از کار رفت، و گرہ کشائی بستہ کاراں را ناخن بشکست۔ نہ کم ہم چہ بگو نہ گویم ؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ قیاس اندازد ؟ کہ مستر اندرو استرلنگ مرد، و از گیتی جز نام نیک با خود نبرد۔ کاش روئے گداختہ (پگھلی ہوئی کانسی) بروز نگوشم ریختندے تا نہ

شنودے کہ چہ شد۔ اکنوں امید غمخواری از کہ باید داشت ؟ و دل را بخیال گردش چشم کہ تسکین داد۔ رپورٹے کہ ذات انصاف بکنس بہادر در خصوص داد خواہی من بہ صدر فرستادہ است۔ چہ گویم کہ چہ مایہ امیدگاہ و اندوہ فزائے بودہ است۔ تکیہ بر کارسازی آں چابک خرام بیداے فنا (یعنی اسٹرلنگ) داشتم۔ اکنوں از گردش سوفلک بکام دشمن ست زنہار در پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید، و بنویسید کہ آں والا گہر را چہ روی داد، و آں گلبن روضۂ مردمی را کدام تند باد از پا فگند، پس از اندوہ سرانجام دفتر کہ بہ شہد و جایش کہ گرفت اللہ بس ماسوا ہوس۔"

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں۔ "والا نامہ رسید، و نوید فراق دائمی مرزا احمد رسانید چہ بہ سنگین دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیت دوست انشا می کنم و اجزائے وجود از ہم نمی ریزد۔ می گفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموش بمیر دست راہ گرداند، و ناقہ، بسر منزل دیگر ندگرفتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت، چرا بحال خورد سالاں خود نپرداخت، و سایہ از سر شان باز گرفت۔ وائے بے یاری یاران وے و دریغا بے پدری پسران وے ہر چند از مرگ نتواں نالید، و گسستن تار و پود پندار ہستی را چارہ نتواں کرد۔ لیکن انصاف بالائے طاعت ست، ہنوز ہنگام مردن مرزا احمد نبود۔ چرا آں قدر صبر نہ کرد کہ بکلکتہ رسیدمے۔ و روئے نکوئے فروزش دگر بارہ دیدمے چہ آں مایہ درنگ نہ ورزید کہ حامد علی جوان گشتے۔ و کار با بخانہ دانش وے روان گشتے، حیف کہ ہمیں پسرش خرد سال ست و باشد کہ بحقیقت سرمایہ پدر دانا دگر و آوردن زرہائے پراگندہ توانا نباشد۔ و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ چنگ آرد بباد دہد و بہ فرزندان خود ستم کند : کجیں برادران ناکام گزارد ہر آئینہ دریں حال بے مایہ ہوشمند و حق شناس جز۔ بوہ سا برآید و غمخواری بے بد ماندگاں نماید بندہ ور من قال ؎

مرا باشد از درد طفلاں خبر
کہ در طفل از سر برفتم پدر

واللہ کہ تیمار آں بیچارگاں ہمیں فرض و فرض عین ست ہم بر شما ہم بر مرزا ابوالقاسم خاں بکیسی ایں جماعہ در نظر باید داشت و غافل نباید بود۔ ان اللہ لایضیع اجر المحسنین۔"

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اس طرح کرتے ہیں۔ "زنہار صد زنہار اے مولوی سراج الدین! بترس از خدائے جہاں آفرین کہ چوں قیامت قائم گردد و آفریدگار بنشیند، من گریہ و مویہ کناں در آں ہنگامہ آیم، و در تو آویزم، و گویم کہ ایں آں کس است کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفتہ و دلم برد، و چوں من از سادگی بر وے تکیہ کردم وایں را از دوستاں برگزیدم، نقش مہر باختہ و بہ بیوفائی گرد خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد ؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد ؟ وائے بر من کہ روزگار ہا گذرد و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا بپاداش وفاست بسم اللہ ہر قدر تواں بیفزائید کہ ایں جا مہر و وفا فراواں است۔ لاجرم جفا نیز باید کرد کہ فراواں باشد و اگر خود ایں تغافل بہ پاداش افزاہ۔ یعنی (بپاداش) جرمے دگر ست گناہ مرا خاطر نشاں باید کرد۔ و آنگاہ انتقام باید کشید تا شکوہ در میان نگنجد و مرا از مہر گفتار نباشد۔ منم کہ معاش من از گونا گوں رنج و رنگ، رنگ عذاب بعاد کفر ماند خون در جگر، و آتش در دل و خار در پیرہن و خاک بر سر ہیچ کافر بدیں روز گار گرفتار

مبارکباد، و ہیچ دشمن ایں خواری مبیناد راست پہ تنہا روی ماتم کہ در صحرا پالیش بگل فرو رود. و ہر چند خواہد کہ بالا جہد نتواند فرو تر رود. والا قدر نواب امین الدین احمد خاں بہادر کہ گیتی را بروپیش دیدے، در حالش از زندگی دل شستے بلکہ رہا شد. دیگر زندگی از بہر کہ خواہم دول را بدیدار کہ شاد ماں دارم و ماندگی من او بیچاں سنجید کہ نتوانستم ہمپا بیش کردن و دو دا داشتم او را تنہا گذاشتن.

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمے کے بگڑ جانے کا حال اس طرح لکھتے ہیں۔ "کار من بدار گاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشید، تباہی گزید. حالیا بر آں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد باز بداں دار الیعنی در سپریم گورنمنٹ رسم و در دل بداں زمزمہ فرد ریزم کہ مرغان ہوا و ماہیان دریا. ابر خود بگریانم. ہیہات! اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ ہم بدیں تفریق از روے دفتر سرکار ثابت شدہ بود بایستے کہ صاحبان صدر مرا از بیش رانندے و گفتندے کہ برزہ مخروش، آنچہ ترا یافت و انمودہ یافتنی از آں افزوں تر نیست او دستہ او داد نیز ہماں ست لاجرم دیوانہ بودے اگر بدیں کشور باز آمدے و بایک قبیل (یعنی با جمعے کثیر) کہ خویشاں و برادران من اند. بہ ستیزہ برخاستے و بہ باطل ستیزی نام برآوردے.

چہ کنم کہ کار برگشت، ورد نگار برگشت خدارا، بنگر دیدہ دل من دارسی کولبرگ بتوسط کرنیل ہنری املاک بر من مہرباں شود، و رپوٹے کہ خوشتر از آں نتواں اندیشید. بصدر فرستد و جوابے کہ سود مندتر از آں نتواں سنجید. از صدر حاصل نماید، ہنوز نہ آں جواب در راہ باشد کہ کولبرگ معزول گردد. و ہاکنس کہ بجاے کولبرگ نشنید. آنچہ بر ہم زدن ہنگامہ سلطنتے را بس باشد. از بہر من بصدر نوشتہ. دمن دراں داوری (معاملہ) از مستر استرلنگ چشم یاوری داشتہ باشم ہنوز آں رپوٹ بصدر نہ رسیدہ باشد کہ مستر استرلنگ رہرو راہ عدم گردیدہ باشد. چوں از ہمہ گسلم و بدامن جارج سوئنٹین بہادر آویزم، گرم از جا برخیزد، و دامن بر شغل جہاں بانی افشاند. سبحان اللہ! با معزول نگردد تا مگر کولبرگ بمرگ ناگاہ نمیرد تا مستر استرلنگ بولایت نرود و تا مگر جارج سوئنٹین، در غور ایں صدمہ ہائے جانکاہ بنا شد مگر اسد اللہ دادخواہ..."

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط بہ دلنواز نامہ پس از عمرے رسید دعاے دیگر بخشید، تا عمر باندہ سپری شدہ را بہ تلافی تواند کرد و تا شاد کردن دلے کہ ہمادش بہ غم سرشتہ باشند نہ آساں ست. ہنم کہ چوں نامہ شما رسیدے مستانہ از جاے برجستے، و جہاں جہاں نشاط اندوختے ایک تا چشم بر سواد ایں صحیفہ دوچار شد گیتی در نظرم تیرہ و تار شد نخست آنچہ بنظر در آمد خرد آشوب خبرے بود کہ دل تا جگر خون کرد. یعنی از جہاں رفتن خواہر عزیز شما. ہے ہے! مخدومہ مرحومہ ہماں است کہ تا در کلکتہ خبر رنجوری وے شنودہ بودید دل از دست رفتہ بود، و سراسیمگی سراپاے خاطر را فرو گرفتہ و نظر دارم کہ از مرگش بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد. توانا ایزد پاک شما را شکیب عطا فرماید و تومندی دل و توفیق ثبات ارزانی دارد و ایں سانحہ در روز نامہ عمر شما خاتمہ مکارہ و مقطع مصائب گرداند.

آشکارا کہ مخدوم مرا از طاقچہ تازہ خوشنودی نیست. ہر آئینہ انکشاف ایں معنی غبار ملال بر دل فرو ریخت. خدا را ازلنگ نتواں شد، و کلکتہ را غنیمت باید پنداشت. شاد شانہ (معمورہ) بدیں تازگی در گیتی کجاست خاک نشینی آں دیار از اورنگ آرائی مرزبوم دیگر خوشتر من ز خدا کہ اگر متاہل نہ بودے، و طوق اہل عیال بگردن نداشتے، دامن برہر چہ ہست افشاندے و خود را اوراں بقعہ رساندے تا زیستے دراں میکدہ بودے، و از رنج ہوا ہائے ناخوش آسودے. نہے ہوا ہائے سرد. و خوشا آبہائے گوار فرخا بادہ ہائے ناب، و حسنہ ما شرہاے پیش رس.

ہمہ گر میوہ فردوس بخوان باشد
غالب آں انبہ بنگالہ فراموش مباد

مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعہ کا قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجا ہے وہ انہوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے۔ جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گزرا تو اس کا شکریہ اور ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے۔ "گمان مرا ناموری ساختن و ہیچ را ہمہ پنداشتن عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ. خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی رو دے نماید، وآں بزرگ مرحمت بے استدعاے سائل بظہور آید. بگمانہ اگر دیدہ حق بیں دارد، بنگر دکہ واجب تعالی شانہ اجزاے ممکنہ را کہ در کتم عدم متواری بودہ اند، بمحض عنایت پیرایہ وجود بخشیدہ، و براں معدومات منت ننہادہ حقا کہ اگر نامے بسزا کردہ شود رقم گشتن قطعہ تاریخ در آئینہ سکندر از ہیں عالم خبری دہد چوں ناخواستہ ایں چنیں نوازش بمیان آمد. ہر آئینہ روائی خواہش مرا چگونہ چشم نتواں داشت لاجرم در گزارش مدعا قطعے بمیان نہادہ آرزو را سرانجام گفتگو دادہ می شود.

نہفتہ مباد کہ قدر شناسی حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر والمعی یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را از تنگ و عار رہاندہ حقا کہ اگر از پایہ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں پایہ بکار ہند کہ از صد یک دا ماند، و باز آں پایہ را بسر رشتہ داری عدالت دیوانی سنجیدہ. ہنوز ایں عہدہ دوں مرتبہ ری خواہد بود. بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد جان (رئیس جھجر) پانصد روپیہ ماہانہ براے مصارف خدام مخدومی معین کرد نزد خود خواند. روزیکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت، ولیعہد خسرو دہلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر مولانا را نا پدرود کند. سوے خود طلبیدہ و دو شالہ ملبوس خاص بدوش وے نہاد، و آب در دیدہ گرداند، و فرمود کہ ہر گاہ شما گوئید کہ من رخصت می شوم. مرا چنانکہ بپذیرم، گریز نیست. اما ایزد دانا داند کہ لفظ وداع از دل بہ زباں نمی رسد الا بصد جر ثقیلی" تا اینجا سخن ولیعہد بہادر ست. غالب مستدعی ست از شما می خواہد کہ واقعہ تودیع مولوی فضل حق و اندوہناکی ولیعہد بہادر در بدرود آمدن و لمعات اہل شہر بعبارتے روشن دیلنے دلا ویز در آئینہ سکندر بقالب طبع در آید و مراد ریں تفقد منت پذیر انگارید. والسلام"

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب کا نشاں دیں کہ جس سے ان کے مفصل حالات معلوم ہوں. نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لیے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے. اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں.

ہر نفسے کہ زکوے تو بجا کم گذرد
یادم از دولہ عمر سکتا زد ہد

رسیدن مہر افزا نامہ دل برد و جان بخشید. اگر چہ آں جان ما من نماند، دم برسا

نامه به فشاندن رفت، لیکن سپاس دلربائی و جان بخشی باقی ست امید که تا جان بخشیدهٔ یزدان در تن ست گزارده آید.

مخدوم من در رسیدن نامهٔ پیشین و دل (متردد) چراست؟ هنوزم نشاط درود آن نمیقه در دل، و سواد سطور آن صحیفه در نظر جا دارد چون فرمان چنان بود (یعنی در نامه پیشین) که غالب خویشتن نشناس. لختے از رسم و راه ستر‌گان پارس بر گوید، و کتابے ازان گروه نشان دهد که ازان دیرین کیش، و ساز این باستانی زبان، ازان اوراق توان یافت عرم دانش من (علم من) اندازه سر انجام پاسخ آن بر نتافت (تحمل نکرد) چون دوباره گفته که خواهش چنین ست ناچار مهر خاموشی از دهان و پردهٔ شرم نادانی از میان برداشته میگویم که روائی این خواهش از هیچکس چشم نتوان داشت. خود را به بند این پژوهش (تلاش) خسته نتوان کرد."

نگارندهٔ داستان مذاهب با این همه لاف آشنا روائی (واقفیت)، آنچه میگوید نه همه است و نه همه بر جاے خود ست (یعنی نه مکمل ست و نه سراپا صحیح ست)، پارسیانیکه در سورت و بمبئی آشیان دارند. زنهار گمان نبری که ازان گروه (یعنی از ستر‌گان پارس) جز نام نشان دارند. آن پویهٔ و آن هنجار (یعنی آن روش و آن طریق) و آن نگارش و آن گفتار ندانند، و جز تخم سوختن و از روے شیوه پارسیان نمانند پارسیان اگر امانیگان روزگار و برگزیدگان داد بوده اند، و به روزگار فرمان روائی خویش و دانشهاے سودمند (علوم مفیده) و کنشهاے خرد پسند (اخلاق پسندیده) داشتند، کشایش راز فراخنای هفت سپهر و نمایش ماه و مهر، پدید آوردن رخشنده گهرها از تهٔ خاک، و بدر کشیدن بادهٔ ناب از رگ تاک، پژوهش اسباب خستگی و رنجوری و گذارش احکام پزشکی (طبابت) و چاره گری، پرده کشائی فهرست اسرار کیانی (سلطنت) و فرماندهی و درصد بندی تقدیم آثار بندگی و فرمانبری، عنوان بیک دگر بستن رنگ رنگ گهرها و هنجار سره کردن گوناگون هنرها دارد. گیاها را خود بهر درو بکار اندر آوردن، و پرندگان درشت را به شکار اندر آوردن کوتاهی سخن والای اندازه هر گونه بینش، و پیدائی اندازهٔ کمال آفرینش، همه در آئینهٔ اندیشهٔ این فرزانگان روی نموده و انگیزش بالیدگی گفتار و کردار که اکنون بماند کے ازان بیاد تازند. از مغز دانش این فرهنگیان بوده است. گنجینهٔ خسروان پارس را از هر علم دفترے بود، و هر دفتر از گرانبهائی گنج گوهرے. چون دولت ازان طائفه روی برتافت، و سکندر ابن فیلقوس بر ایران دست یافت. کتب خاص خسروی تاراج رفت اما آنچه پراگنده بود و گمنام بهر گوشه و کنار داشتند بر جا ماند. تا به روزگار پیروزی تازیان در ان کشش و کوشش از هر جا گرد آمد (فراهم آمد) و به فرمان خلیفه افروزینهٔ گلخن گرمابهاے (حمام هائے) بغداد شد. همانا احکام آذر پرستی هم. به آذر بازگشت زبان آوران عرب پارسی را بتازی آمیختند، و زبانے تازه برانگیختند. اکنون کیست تا بدان زبان کهن سخن درست تواز گفت، و ازان دیرین آئین براستی خبر تواند داد پژوهنده ازین راز را کام دل بر نیاید، و من هما که هر چه بس از فراوان جستجو فراهم آورده آنچنان باشد که دل بدان توان نهاد. دیگر آنچه کلک گهربار بدان رفته که منتخبے از گفتار نارواے خود برنگارم و لختے از ماجراے خود برگزارم. اندیشه را طلب گزیدن و خرد را شگفت زار (در محل تعجب) افگند.

بگریم از دل و جانے که در بیاد من ست ستم رسیده یکے ناامیدوار یکے

از چه بدان ارزم و مرا این پایه از کجا باشد که ستودگان مرا ستایند و گفتار مرا و نه که شعرا جادو هند از مرجام فرهمندی هستی (یعنی از شان و شکوه هستی) در سر و برگ پیدائی.

بسکر نزد آشکارا بینان. زود زدان و بو الابد کیمیا گریبان (یعنی قائلان وحدت وجود) نمود بے بود ست. آنچه من داده اند زبانے ست یاوه سراے و خامه ایست بیهوده پوے. من هم از بے مزگی چون کودکان که درم از سفال سازند و به گنجینه داری نازند سرودهٔ زبان و بیهوده خامه (یعنی کلام خود را) پاره پاره بهم بسته و ریزه ریزه گرد آورده بگمان نام آوری که دل از تاب اندوه نارسائی آن خون ست. دیوانے ترتیب داده جابجا بنظرگاه التفات یاران فرستاده ام بنگارنے که به پرسش غالب ستمزدهٔ آمده. سواد هر غزلے که خواهند ازان اوراق بردارند که انتخاب و انتقاد اشعار حواله به راے نامه گرد آور (یعنی مولف تذکره) است نه باشاره و ایماے سخنور اما اگر گزارش حال سخنور هوس ست، خود این مایه بس است که چون در جریدهٔ آن فن از من سخن رانند. سخن را در ستائش من بدین گونه پرس نشانند که از ناکسان روزگار و بیکسان دیار مسلمان زاده است که فرما جاه و گبری ست مسلمان نما که از غلط نمائی غالب تخلص می کند و بدین رنگ ژاژ می نماید.

فرسندی غالب نبود فتنه گفتن یک بار بعزیماے که اے هیچکس ما

پنهان نماناد که در اصل آفرینش از دوده روز فرو رفتگان، و حلقهٔ بخت برگشتگان ستم رسیده و ردهٔ بهی نادیده کسم آرائش سخن پیش کش (یعنی بر طرف) ترک نژادم، و نسب من با فراسیاب و پشنگ می پیوندد بزرگان من ازانجا که با سلجوقیان پیوند هم گوهری داشتند، و لیعهد دولت ایشان رایت سروری و سپهبدی افراشتند بعد سپری شدن روزگار جاه مندی آن گروه (یعنی سلجوقیان) چون ناروائی (کساد بازاری) و بینوائی روے آورد چهے را ذوق رهزنی و غارتگری از جاے برد و طائفه را کشاورزی پیشه گشت. نیاگان مرا به تورانی زمین، شهر سمرقند آرامگاه شد ازان میانه نیاے من از پدر خود رنجیده آهنگ هند کرد، و به لاهور بهمراهی معین الملک گزید چون بساط دولت معین الملک در نوشتند، بدهلی آمد، و با ذوالفقار الدوله میرزا نجف خان بهادر پیوست. زان پس پدرم عبدالله بیگ خان بشاه جهان آباد بوجود آمد، و من به اکبرآباد. چون پنج سال از عمر من گذشت، پدر از سرم سایه برگرفت عم من نصرالله بیگ خان چون خواست که مرا به ناز پرورد. ناگاه مرگش فراز آمد کم بیش پنج سال پس از گذشتن برادر پے همین برادر برداشت و مرا درین خرابه جا تنها گذاشت و این حادثه که مرا نشانهٔ جانگدازی دگر و دن را آگینه بازی بود در سال هزار و هشت صد و شش عیسوی بهنگام هنگامه لشکر آرائی و کشور کشائی صمصام الدوله جرنیل لارڈ لیک بهادر بروے کار آمد چون عم مرحوم از دولتیان دولت اهل فرنگ و با انبوهی چار صد سوار به رکاب صمصام الدوله با سرکشان سرگرم جنگ بود، و هم از بخشش هاے سرکار انگریزی دو پرگنه حاصل از مضافات اکبرآباد به جاگیر داشت. سپه سالار سرکار انگلشیه به خون بهاے آفتاب (یعنی نصرالله بیگ خان) کلبهٔ تار گدایان را چراغ، و ما بینوایان را بعوض جاگیر بمشاهرهٔ از خار خار جستجوے وجه معاش فراغ بخشید تا امروز که شمارهٔ نفس شماری زندگانی به چهل و چهار می رسد، بدان رابطه خرسندم، و بدان مایه قانع و در سخن از پرورش یافتگان مبداء فیاضم، و سواد معنی را بفروغ گوهر خویش روشن کرده ام. از هیچ

آفریدہ حق آموزگاریم بگردن، و بار منت رہنمایم بہ دوش نیست۔

غالب بہ گہر ز دودہ زادشمم | زاں رو بصفائی دم تیغ ست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر | شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

"نامہ بہ پایاں رسید، و شرم پراگندہ گوئی و درازنفسی من بر اشتلم کرد دیدہ دراں دانند کہ گفتنی فراواں بود و افسانہ پریشاں تا کجا اندک گفتے، و گفتارا از درازی نگاہ داشتے۔ مرا در انچہ رفت گنہے نیست و اگر خود گناہ است دوست کریم است و کرم عذر خواہ۔ والسلام۔"

منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص کے باپ رائے بجھل رہوی نے مرزا کو جبکہ وہ کلکتہ میں تھے ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مسند نشین ہوا ہے لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اس کی جبلت میں ہے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں: "ایکہ گفتی فلانی روش حکیمانہ دارد و دنیا را بکار آگاہانہ می گذارد۔ با ایں ہمہ اندوہناکی خندہ ام در گرفت و عنان ضبط خویش از کفم بدر رفت۔ ندانی کہ بر اسپاں باد رفتار برنشستن و گرد ہا گرد مردم را پیشاپیش دوانیدن، تن را بلباس زرنگار رنگ برآراستن و معدہ را بہ الوان خوردنیہا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بروں راندن، و غبار معصیت بر فرق افشاندن، از حکما نیاید و جز نشکال را نشاید کار دانشوراں چیست؟ رو از آبادی در بن کوہے نشستن و از شش جہت در بروے خلائق بستن، تن را بہ ریاضت فرسودن و جاں را بہ تجردی پالودن۔ ہر کہ حکیم خرد گزیں ست کار و بارش ایں ست۔ بے برگ و نوا شکنجۂ گوناگوں حسرت بر دبستہ بہ فراخ اے سرخوشی (مستی) رسیدہ است، از کجا کہ آزادہ و بالطبع کریم بود۔ ہنوز از جیب من از ریاح غلیظہ عالم کہ بہ ممتلی داری ہر آئینہ لغزاں بادست رونسے چند باش تا بنگری گرہ بر کیسہ زد زناں او و حسرت ز تلف کردہ زاری کناں ایں کہ فلاں و بہماں را از نعم خویشتن راندہ است۔ حقا کہ روے در مصلحتے نداشت و ہر چہ کرد از بے خردی و ابلہی کرد۔ چہ۔ اگر دانا بودے ذخیرہ داشتے آناں را کہ راندہ است نراندے و کارہا از آناں گرفتے و ایناں را کہ باخود در یک پیرہن جا دادہ است۔ چوں خیاہ از دامن افشاندے، و ہرگز بہ ہوائے ایناں نرفتے کودکی رہا کمال در دید، گرد درایام صاحبزادگی و ولیعہدی از آناں دل برداشت، و با ایناں لختے رام بود۔ از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن و در دام ایناں بدیں کوری در آمدن، نہ لغزان دانش ست نہ لغزان جنبش، حکیم گرامیگوی و کرم پیشہ گرامی خوانی؟ ... چوں سخن دریں باب بسیار ست نامہ بہ دعا ختم می کنم دیدہ را بینشے درست و دل را دانشے سودمند روزی باد۔"

مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ جسے مرزا باندہ سے مل کر کلکتے روانہ ہوئے ہیں۔ کلکتے میں پہنچ کر ان کو سفر کی تمام روداد لکھی ہے۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں: "روز سہ شنبہ چہارم شعبان پارۂ از روز برآمدہ در کلکتہ رسید، عزیب لوازمہاے وہاب بے منت را نازم کہ درچنیں دیار خانہ چنانکہ باید و ہر گونہ آسائش را بکار آید، ہم اورا باندازہ فراغ خاطر آزادگان فضائے و ہم اندرو ماننداں آذوقہ طلباں بیت الخلائے، و در گوشہ صحن چہ از آب شیریں چاہے۔ و ہر طرف بام و در خود اہل تنعم آرامگاہے بے آنکہ جستجوے رود، یا گفتگوئے شود بے منت و بے زحمت کرایہ دہ روپیہ ماہانہ بہم رسید، و آدم و چاروا را تکیہ گاہ آرامش گردید و دو روز از رنج راہ آسودہ نشد لامع النور (یعنی منقادش نامہ مولوی محمد علی خاں)

را انشغل راہ مدعا ساختم و در کشتی نشستہ آہنگ ہگلی بندر کردم۔ لطف ملاقات نواب علی اکبر خاں طباطبائی اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد، رواست، و اگر گویم کہ مرا برمن بر شنگ آورد و نیز ج دادو بخدائیکہ خرد آفریدہ و خرد و ر برگزیدہ جز یں نائیگی و صاحبدلی در بنگالہ دیگرے نخواہد بود۔ یارب ایں گوہر گرامی از کدام کان ست، و ایں گرامی گوہر (گرامی ذات) از کدامی دودماں۔ باوے چوں نخستیں صحبت بود۔ بیچارہ جوئی و مصلحت پرسی در و سر ندادم، و دو سہ ساعت نشستہ بلکمدہ باز آمدم۔ آوخ (افسوس) کہ دریں روزہا نواب را با حکام ہگلی در خصوص زمینے کہ وقف امام باڑہ است معارضہ در پیش و دل سرگرم تکرار خویش ست۔ واللہ در القائل۔

ہمہ را ماتمی حسرت دنیا دیدم | چوں بعشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم
روزگار دفتر ما بزد بخت فرماں پذیر باد۔

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں: "از نوادر حالات اینکہ سخنوراں و نکتہ رساں ایں بقعہ بس از ورود خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند در ہر ماہ شمسی انگریزی روز یکشنبہ نخستیں سخنگویاں در مدرسۂ سرکار کمپنی فراہم شدندے و غزلہاے ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است دراں انجمن می رسد، و اشعار مرا شنودہ بہ بانگ بلند می ستاید۔ و بر کلام نادرہ گویان ایں قلمرو تبسم ہاے زیر لبی می فرماید۔ چوں طبائع بالذات مفتون خود نمائی ست، ہمگناں حسدی بردند، و کلانان انجمن و فرزانگان فن بر دو بیت من اعتراض نادرست بر آوردہ آنرا شہرت می دہند بے آنکہ مرا از باں بپاسخ آشنا شود۔ از دانشوراں، کہ مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خاں و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن از آنانند جوابہای یابند۔ ولیں زانوے خموشی می نشینند۔ چنانچہ ہم بہ فرمان ایں دو بزرگوار مثنوے انشا کردہ ام۔ و بعد از اظہار عجز و انکسار خویش جوابہاے اعتراض دراں ابیات موزوں ساختہ و آں مثنوی (یعنی مثنوی باد مخالف) پسندیدۂ طبع عالمے افتادہ است۔ انشاء اللہ العظیم زیں بعد عریضہ کہ بہ والا خدمت خواہد رسید ورقے از آں ابیات درنورد آں خواہد بود۔"

نواب ضیاء الدین احمد خاں اکبر آباد گئے ہوئے ہیں۔ مرزا ان کو اپنے قدیم وطن اکبر آباد کی یاد میں دل سے اس طرح لکھتے ہیں۔

"جان برادر! اشک و آہ غالب نامراد لختے آب و ہوائے اکبر آباد بہ شماساز گار باد۔ گرفتم کہ عود البسر گرفتہ (یعنی فرض کردہ آید) در نزدیک خود یعنی بدانست خود از من دور تر رفتہ آید، اما چوں ہنوزم در وطنید ہمانا کہ نزدیک با منید شادم کہ شوق دور اندیش دیدہ و دل ما دریں سفر باشما فرستادہ تا ہمدریں عزبت (یعنی در دہلی) داد شادمانی دیدار وطن نیز توانم داد۔ زنہار اکبر آباد را بچشم کم (یعنی بچشم حقارت) ننگرند، و از رہگذرہاے آں دیار الحفیظ گوئی و الاماں سرائی، گذرند کہ آں آباد چہ ویران و آں ویرانہ آباد بازیگاہ بچو من مجنونی، و ہنوز آں بقعہ دادہ ہر کف خاک چشمۂ خونی ست۔ روزگارے بود کہ دراں سرزمیں جز مہر گیاہ (نام رنگی) نہ رُستے، و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح دراں گلکدہ (یعنی آگرہ) بہ مشتاق دیدن دلہا را آں مایہ از جا برانگیختے (یعنی بشورش آوردے) کہ رنداں را ہوائے صبوحی از سر و پارسایاں را نیست نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند ہر ذرۂ خاک آں

گل زمیں را از تن پیاسے بود دلنشیں، دہر برگِ آں گلستاں را از جاں ورد دے بود خاطر نشاں، اما تازگی وقت شمار اور نظر واشتہ درد و پردہ شور پرستش برانگیختہ بود، وچشم براہ داشت کہ کے نولیند او دریغ کہ ہیچگاہ تنوشتند کہ رخش نگین (یعنی اسپِ سنگین کہ در اکبرآباد معروف است) دعاے مرا کدام ادا پذیرفت؟ ودریا بجا سخ سلام من بہ زبان موج چہ گفت؟"

میر مہدی کے نام —

سید! خدا کی پناہ! عبادت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہاں کو سر پہ اٹھایا ہے۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر جہاسہ نکلا ہے۔ تم کو سرمایۂ آہ آتش گفتار بہم پہنچا ہے۔ میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی! یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا۔ کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی اٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے میں باقی ہیں۔ آیخ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے!

مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے۔ اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی — اور کیسی بڑی خوشی — وہی ہے۔ تم کو یاد ہو گا کہ ایک "دستنبو" نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے۔ کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی۔ وہی القاب قدیم۔ کتاب کی تعریف۔ عبارت کی تحسین۔ مہربانی کے کلمات۔ کبھی خدا تم کو یہاں لائے گا۔ تو اس کی زیارت کرنا۔ پنس (پنشن) کے ملنے کا حکم آج کل میں آیا چاہتا ہے۔ اور یہ توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔

میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا۔

(۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

بھائی!

ایک خط تمہارا پہلے پہنچا، اور ایک خط تمہارا کل آیا۔ پہلے خط میں کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اگرچہ کل کے خط میں بھی صرف کتابوں کی رسید تھی۔ لیکن چوں کہ دو امر لکھنے کے لائق تھے اس واسطے ایک لفافہ تمہاری پسند کا تمہاری نذر کرنا پڑا۔ پہلا امر یہ کہ آج میر نصیر الدین دوپہر کو میرے پاس آئے تھے۔ ان کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تم نے بھی خط لکھا تھا کہ میر سرفراز حسین الور گئے۔ اور میر نصیر الدین بھی کہتے تھے۔ کہ میں اور وہ ایک دن پانی پت سے چلے۔ وہ اُدھر گئے، اور میں اِدھر آیا۔ ظاہرا پارسل کے پہنچنے سے پہلے وہ روانہ ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب رہ گئی۔ اب ان تک کیونکر پہنچے گی؟ خدا خیر کرے!

میاں لڑکے! سنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد عظیم صاحب کے۔ وہ خلیفہ تھے۔ مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ اس واسطے میر نصیر الدین کو پہلے بندگی لکھتا ہوں اور پھر تمہارے علاقے سے ان کو دعا لکھتا ہوں صوفی صافی ہوں۔ اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں۔

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

یہ جواب ہے تمہارے اس سوال کا کہ جو پہلے خط میں تم نے لکھا تھا اب کی خط میں تم نے میرن صاحب کی خیر و عافیت کیوں نہ لکھی؟ یہ بات اچھی نہیں۔ میں تو ڈر گیا۔ کہ اگر تمہارے خط میں ان کو دعا سلام لکھوں گا۔ تو ان سے تم کاہے کو کہیو گے؟

پیرزادے صاحب یعنی میر نصیر الدین نے ان کی بندگی مجھ سے کہی ہے واسطے خدا کے میری دعا ان کو کہہ دینا۔

(۴ جولائی ۱۸۵۹ء)

برخوردار! نور چشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو بھائی! تم نے بخار کیوں آنے دیا؟ تپ کو کیوں چڑھنے دیا؟ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا۔ جو تم مانع نہ آئے؟ کیا تپ ابن بنگم آئی تھی؟ جو اس کو روکتے ہوئے شرماتے۔ حکیم اشرف علی ابھی گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے نسخہ لکھ کر آج ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ چونکہ یہ خط بھی آج روانہ ہوتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ دونوں خط ایک دن بلکہ ایک وقت پہنچیں۔ دل تمہارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے، اور تمہاری تندرستی کی خبر مجھ کو سنائے۔ سنو میاں سرفراز حسین! ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا، وہ بھی اس طرح کہ جیسا جلالی اسیر کہتا ہے۔

بنیہ در شکر اب است و رہ بادارد!

پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے۔ مجھ کو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں۔ شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ لوہ خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب! سرنامہ میرے نام کا۔ آغازِ تحریر میں القاب میرا! پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا — یہ کیا سیر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم کرو گے۔ اور میرن صاحب کا نام اور ان کے سلام تک بھی اس میں نہ ہو گا۔ تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا۔

اور ہاں میاں! پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا؟ کہ ہم نے سنا ہے کہ چچا نے اس کا مرنا سنا ہو گا۔ اس عزیب کا قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو یہ معلوم ہو گا کہ کون سی لڑکی مری۔ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے۔ تاکہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے۔ اب میں کس کا نام لے کر روؤں — اور کس کی فاتحہ دلواؤں؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے۔ تو جنیع بقید نام لکھو۔

(۳۱ — ۱۸۵۹ء)

میری جان! اسمعو داستان!

صاحب کمشنر بہادر دہلی۔ یعنی سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنج شنبہ ۲۴ر فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے میں اٹھ آیا۔ پھر آیا، جمعہ ۲۵ر فروری کو گیا، ملاقات ہوئی، کرسی ملی۔ بعد پرسش مزاج سے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا۔ کہ یہ خط ہے۔ مکلوڈ صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں۔ کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں۔ کہ تم ملکۂ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا۔ وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک مکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے۔ اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ کل حاضر کروں گا۔ پھر پنسن کا حال پوچھا۔ وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

دیکھو میر مہدی! حاکم پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنسن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بہ حکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے۔ یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کر دوسرے دن یک شنبہ یوم تعطیل تھا۔ میں اپنے گھر رہا۔ دو شنبہ ۲۸ر فروری کو گیا۔ باہر کے کمرہ میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا اچھا توقف کرو۔ بعد تھوڑی دیر کے گردھ کپتان کی چٹھی آئی۔ سواری مانگی۔ جب سواری آگئی۔ باہر نکلے۔ میں نے کہا۔ وہ کتابیں حاضر ہیں کہا منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ ادھر سوار ہو گئے۔ میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ کو ہو گیا۔ بہت انبساط اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ دکھائے۔ ایک خط مکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا۔ وہ دے کر یہ التماس کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ بہت اچھا کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا۔ کہ ہم نے تمہاری پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر کو کچھ لکھا ہے۔ تم ان سے ملو۔ عرض کیا بہتر اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا۔ گئے ہوئے تھے۔ کل وہ آئے۔ آج میں نے ان کو خط لکھا ہے۔ جیسا کہ وہ حکم دیں گے ان کے موافق عمل کروں گا۔ جب بلائیں گے تب جاؤں گا۔ دیکھو سید! اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا نہ رہنے دیا۔ پھر بس ملکے سے، وہ آج سلطنت کا دھندہ ہے۔ میرے تنقد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے مجھ کو عزت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا۔ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟

میر سرفراز حسین کو یہ خط پڑھا دینا۔ اور ان کو اور نصیر الدین کو اور میرن صاحب کو دعا کہنا۔

(۴ر مارچ ۱۸۵۹ء)

میاں کس حال میں ہو، کس خیال میں ہو؟

کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں ان کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوش دامن صاحب بلائیں لیتی ہیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چپ۔ جی یہ چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان، ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہوتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے۔ مگر ایسا جانتا ہوں۔ کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو سے کھول لیں گے۔ اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا یہی ہوگا۔ کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے۔ اور وہ محل غور ہے۔ اس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند ساتھ کر دیا ہے۔ اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے۔ اور قلاقند تمہاری نذر کر کے تم پر احسان دھریں گے۔

بھائی! میں دلی سے آیا ہوں۔ قلاقند تمہارے واسطے لایا ہوں۔ زنہار دیجیو۔ مال مفت سمجھ کر لے لیجیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے۔ کلو۔ ایاز کے سر پر قرآن رکھو۔ کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو۔ بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں۔ کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا اور سنو۔ مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک ان کے پہنچانے کو گئے۔ رسم مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون بڑا ہے۔ اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ قران پر اپنی جان نثار کرتے ہیں۔ عورتیں صدقے جاتی ہیں۔ مرد پیار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلماء مولانا سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ —

طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھا جو آدمی بنا چاہے۔ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام۔ یہی ہے مذہب حق۔ والسلام والاکرام — علی علی کہا اور فارغ البال رہا کر۔

(۳۰ر جون ۱۸۶۱ء)

واہ — وا سید صاحب!

تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے۔ مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں؟ جو سخن پردازی کروں؟ —

بھائی! تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے دو دو نیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل، کیا دو دو نیل یہ سب تمسخر کی باتیں ہیں۔

لو سنو ۔ اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماران کے دروازے کے پاس کی کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام ــــ کچھ نہیں، پنسن داروں سے حاکموں کو کام کچھ نہیں تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ، زینت محل یہ کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گئی۔ دیکھیے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں؟ خلق نے از روے قیاس، جیسا کہ دل کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اڑا دی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ ر دسمبر کی ہے، اب شنبے کو بڑا دن اور اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان سرفراز حسین! تم کیا کر رہے ہو؟ اور کس خیال میں ہو؟ اور آئندہ عزیمت کیا ہے؟ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاق دیدار!

میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جاتے اور لاتے۔ حضرت! آئیے، سلام علیکم۔ مزاج مبارک کیسے! مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا ہو تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ یہ شفق علی صاحب اور میر سرفراز علی کم اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت ہی کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں کیا کروں؟ میں کہیں، تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ تم کیسے بے ادبیاں کر سکتے۔ انشاء اللہ خود جب ایک جا ہوں گے، انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیونکر ایک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے! اللہ! اللہ! اللہ!

(بدھ ۲۲ ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

میاں!

کیوں تعجب کرتے ہو۔ یوسف مرزا کے خطوط نہ آنے سے؟ وہ وہاں بھی وضع ہے، حاکموں کے ہاں آنا جانا، نوکری کی تلاش۔

حسین مرزا صاحب بھی وہیں ہیں؟ وہاں کے حکام سے ملتے ہیں۔ وہ بھی پنشن کی درخواست کر رہے ہیں۔ ان دونوں صاحبوں کے ہر مہینے میں ایک دو خط مجھ کو آتے ہیں، میں جواب بھیجتا ہوں۔

بھائی! لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عمل داری میں ایسا امن و امان ہوگا۔ نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہوگا۔ اُمرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں بقدر مراتب تعظیم و توقیر۔ پنشن کی تقسیم علی العموم۔ آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

اور ایک نقل سنو۔ وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ محلے میں ہندو بھرے ہیں۔ اہل اسلام نہیں۔ ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا۔ اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دلی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عمل داری کی وہی صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے۔

"ٹکٹ آبادی اندرون شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ"

مقدار روپے کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار کا ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبے سے دیکھیے یہ کاغذ کیونکر تقسیم ہوں۔

یہ کیفیت عموماً شہر کی ہے۔ خصوصاً میرا حال سنو۔ بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کا حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خان پنشن دار کی کیفیت لکھو کر وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی بھیجے جائیں گے۔ اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا۔ اور آئندہ کو پنشن جاری ہو جائے گا۔ نہ صاحب یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس مستحق ٹھہروں گا۔ چھ مہینے کا یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پانے کا۔

میرن صاحب جو بلائے گئے ہیں۔ اس طلب کے جواب میں یہی کیوں نہیں لکھتے۔ کہ ٹکٹ میرے نام کا حاصل کر کے بھیج دو۔ تو میں آؤں۔ دیکھو اب دس پانچ دن میں سب حال کھلا جاتا ہے۔ میر سرفراز حسین کو دعا اور میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔ میرن صاحب کو مبارک باد کہنا۔

(یکم مارچ ۱۸۵۹ء)

کیوں یار کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں؟ تمہارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

کلو کو مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ آپ کہیں جائیے گا نہیں۔ میں آتا ہوں۔ بھلا بھائی اچھی حکمت کی۔ کیا وہ میرے بابا کے نوکر تھے؟ کہ میں ان کو بلاتا؟ انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ تکلف نہ کریں، میں حاضر ہوتا ہوں۔ دو گھڑی کے بعد وہ آئے ــــ ادھر کی بات، اُدھر کی بات، کوئی انگریزی کاغذ دکھایا، کوئی فارسی خط پڑھوایا۔ اجی کیوں حضرت! آپ میرن صاحب کو نہیں بلاتے؟ صاحب میں تو ان کو لکھ چکا ہوں کہ تم چلے آؤ اور ایک مقام کا ان کو پتہ لکھا ہے کہ وہاں ٹھہر کر مجھ کو اطلاع کرو۔ میں شہر میں بلا لوں گا۔ صاحب! اب وہ ضرور آئیں گے۔ آخر کار ان سے اجازت لے کر اب تم کو لکھتا ہوں۔ کہ ان سے مختصر یہ کلمہ کہہ دو کہ بھائی یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ یہ کہتا ہوں کہ عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں کرو۔ یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ ۲۱،

طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آئندہ خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے؟ میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا اور شفیع احمد صاحب کو اور میر احمد علی صاحب کو سلام کہنا۔ میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا۔ یہ خط پڑھا دو اور ادھر کو روانہ کر دو۔

کیا خوب بات یاد آئی، کیوں وہ شہر سے باہر ٹھہریں؟ اور کیوں کسی کے بلانے کی راہ دیکھیں؟ شکرم میں، کرانچی میں، چوپہیے میں یعنی ڈاک میں آئیں، بلی ماروں کے محلے میں میرے مکان پر اتر پڑیں۔ میرزا باقر علی بیگ کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں۔ میرے ان کے مسکن میں ایک میر خیرات علی کی حویلی درمیان میں ہے۔ ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا۔ یہ صلاح تو ایسی ہے کہ اگر اس خط کے پہنچتے ہی چل دیں تو ابھی عید یہیں کریں۔

(۳ مئی ۱۸۵۹ء)

برخوردار کامگار میر مہدی!

"قطعہ تم نے دیکھا؟ سچ مچ میرا حلیہ ہے۔ واہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں کے بھیجنے کے لیے لکھا، ارادہ تھا کہ خط میں لکھوں۔ لڑکوں نے ستایا کہ چلو دادا جان کھانا تیار ہے ہمیں بھوک لگی ہے۔ یہ خط اور رکھ رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیا لکھوں۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر، ٹکٹ لگا کر سرنامہ لکھ، کلیان کے حوالے کر، گھر میں چلا گیا۔ اور ہاں ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں، میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے۔ سو ہی ہوا۔ تم نے جلے پھپھولے پھوڑے۔ تو اب بتاؤ خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ کیا لکھوں؟ یہاں کا حال زبانی میرن صاحب کے سن لیا ہوگا۔ مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہوگا بے اصل باتیں ہیں۔ پنسن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیش نظر ہے۔ یہاں کے حاکم نے ایک روبکاری لکھ کر، اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی۔ میرا اس میں کیا مزہ؟

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آگئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا، باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا، منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں، میں پلنگ پر لیٹا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ، اس کے سر پر ٹوکرا اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا۔ آہا! سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسید بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے فیض خاص نہیں لطف عام ہے۔ شراب نہیں آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سر بہ مہر گلاس سمجھا، میوے سے بھرا ہوا۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی (۸۰) تھے، پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ گئے۔ تا ان کی بُرائی اوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیئے۔ میں نے کہا۔ بھائی! یہ کیا کم ہے؟ مگر میں تمہاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہوا۔ تمہارے پاس روپیہ کہاں ہے جو تم نے آم خریدے؟ خانہ آباد و دولت زیادہ۔

یکمہ ایک انگریزی ______ شراب ہوتی ہے، قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے، ہاں فرہنگ سرور میں ہو تو ہو۔ مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی لکھنؤ گئے، ان کے علم کی کتنی ہیں اور رنگے ٹکے کی کتابیں چالیس روپے کو لے گئے ہیں۔ میری دعا کہہ دینا۔"

(۶ جولائی ۱۸۵۹ء)

میری جان! خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے!

"بوڑھا ہونے کو آیا۔ داڑھی میں بال سفید آگئے مگر بات کبھی نہ آئی" پنسن کے باب میں کیسے ہو اور کیا بے جا الجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء مہینے سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینہ ہے۔ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بہ طریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ تو اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعے سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں۔ یہ حضرت کا سوال امیر خسروؒ کی انمل ہے۔

"بھیل لبھرلا لے گئی تو کاہے سے چھیلوں راب"

علی بخش خان پچاس روپے مہینہ پاتے تھے۔ بائیس مہینوں کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسین خان سو روپے مہینے کا پنسن دار، بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لعل ڈیڑھ سو روپے، بائیس مہینے کے تینتیس سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ملے۔ اس طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آئندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔

مجھ کو پھر مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط لکھے تو اخیر خط پر کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ۔ "سائل کو بہ طریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔" میں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔ آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر، ایجرٹن صاحب بہادر بہ طریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت (واپسی) کریں گے۔ تب شاید آبادی ہو گی یا کوئی نئی صورت نکل آئے۔

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

(۱۴ فروری ۱۸۵۹ء)

سید صاحب!

نہ تم مجرم نہ میں گناہگار، تم مجبور میں ناچار!

نواب تم کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفےٰ خان بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سوان کی تقصیر معاف ہوئی۔ اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی جائیداد اور پنسن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بمجرد اس خبر کے استماع کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ یاد نہیں۔ مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج جمعہ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھوں۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو۔ کون بے ٹکٹ مقیم ہے۔ اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ ـــــ

"اسد اللہ خان پنسن دار ۱۸۵۰ء سے بلیماروں والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا۔ نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے"

پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان و دکان کیوں بناتے ہیں! جو مکان بن چکے ہیں۔ انہیں ڈھا دو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ـــــ ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بہ قدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر بربار ہو جائے ـــ آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے دیکھیے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے۔ جو رہتے ہیں۔ وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں۔ یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔

نور چشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے جو وہ چاہیں قبول کریں۔

(فروری ۱۸۵۹ء)

میر مہدی! جیتے رہو!

آفریں! صد ہزار آفریں! اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔

سنو! دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پتی۔ انصاریوں کے محلے کا۔ رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے!

میری پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کماحقہ سمجھ لو۔

"و طرحان الطاف خفیۃ" ایک طرز خاص پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا۔ کہ حاکم دہلی سے فلانے شخص کے پنسن کے کل چڑھے ہوئے روپے کے یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل فوراً بہ طرز مناسب ہو گی۔ کم و بیش دو مہینے میں روپیہ سب مل جائے گا۔

اور ہاں! صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپیہ خزانے سے منگوا لو ـــ میں نے کہا۔

"صاحب! یہ کیسی بات ہوئی کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ دلواتے ہو؟ فرمایا کہ تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا ـــ اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا ـــ آج دو شنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپے منگا لوں۔ پیداد ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اسی کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے۔ مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے کہ یہ دو حاکم۔ یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ دستنبو منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب یہی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دے دی۔ اب دیکھو حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔ اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو باتیں کرنے کا مزہ ملا۔ تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میر سرفراز حسین۔ میرن صاحب، میر نصیر الدین کو دعا۔

(دو شنبہ، ۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال۔ جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر

ہنس بول لیتے تھے :۔

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک!
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یہ شعر میر درد کا ہے۔ کل سے مجھ کو میکش بہت یاد آتا ہے۔ بھو صاحب! اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو۔ اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہرحال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو کیا لکھتا ہوں۔

سنو! پنشن کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال معلوم نہیں۔

دیر آید درست آید۔

بھئی! میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت، نہ مجھ کو تہنیت۔ بلکہ اس طرح سے لکھا گیا ہے۔ کہ گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے۔ اچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ”ہے ہے۔ کیا غضب ہوا! یہ کیوں اچھے ہو گئے؟“ یہ باتیں تمہاری ہم کو پسند نہیں آئیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سنا ہوگا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں۔

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں
دلی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یوں ہے۔

میر کو کیوں نہ مغتنم جانوں
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

میر کی جگہ میرن اور رہا کی جگہ بچا۔ کیا اچھا تصرف ہے! اے میاں! تم نے کچھ اور بھی سنا۔ کل یوسف مرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ نصیر خان عرف نواب جان ولد الدان کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیسی آفت آئی ہے۔ یوسف مرزا تو جھوٹ کاہے کو کہے گا۔ خدا کرے اس نے جھوٹ سنا ہو۔

لو بھئی! اب تم چاہو بیٹھے رہو۔ چاہو اپنے گھر جاؤ۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا بیٹا حسین علی خان یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خان جس کا روز مرہ ہے۔ کھلونے منگا دو۔ میں بھی بجار جاؤں گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔

(۳؍اپریل ۱۸۵۹ء)

خوبی دین و دنیا روزی باد!

میر اشرف علی نے تمہارا خط دیا۔ وہ جو تم نے لکھا تھا۔ کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہم نام کے ہاتھ جا پڑا۔ صاحب قصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو۔ جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں۔

نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا۔ نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ ہم تخلص بہم پہنچایا۔ فقط۔

پنسن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتے کا دن ساتویں اگست کی مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر نے بلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے۔ تردد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں۔ یا صرف آئندہ کو مقرر ہوتی ہے۔

غلام فخرالدین خاں کی دو ایک روبکاریاں ہوئی ہیں۔ صورت اچھی ہے۔ خدا چاہے تو رہائی ہو جائے۔

صاحب! ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی کو تمام کیا۔ دفتر بند کر دیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا۔ اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا۔ کہ تم اپنے اوراق کا فقرۂ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو تاکہ میں اس سے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔

ہاں صاحب! میر اشرف علی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ میر سرفراز حسین نی پت آیا چاہتے ہیں۔ اگر آ جائیں تو مجھ کو اطلاع کرنا۔

(۸؍ اگست ۱۸۵۸ء)

سید صاحب!

تمہارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی۔ جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا۔ تو کیا معلوم ہوا، کہ ڈھائی سو روپئے۔ ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں۔ ڈھائی سو کیسے؟ سبحان اللہ! باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا سے۔ آبرو بچی۔ اب میر سرفراز حسین کو چاہیے کہ الور چلے جائیں۔ شاید نئے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔ پنسن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو۔ تو کہوں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملے میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہرحال اتنا سنا ہے۔ اور دلائل و قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں۔ اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنسن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم۔ نہ کسی کو خبر۔

میاں! کیا باتیں کرتے ہو! میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آئے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو گھر میرے لے آیا انہوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمے لیا، مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلد میں منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیئے۔ صاحب مطبع نے بقول منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا

شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمالِ خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے اس پچاس جلد میں سے شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔ بھائی! میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے۔ اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔

امین الدین خان کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیوں کر لکھتا؟ ان کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے اگر ختم کر کے مسودہ ان کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟

اہلِ خطہ کا حال اندورے تفصیل مجھ کو کیوں کر معلوم ہو۔ سنتا ہوں کہ دعوائے خون پیش کیا چاہتے ہیں۔ سودا ہو گیا ہے۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ بلیک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اڑ گئے۔ گورنمنٹ مدعی نہ ہوئے۔ قصاص نہ لیا۔ اب ایک ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟

اے سبزۂ سُردہ از جورِ پا چہ نالی
در کیشِ روزگاراں گلِ خوں بہا ندارد

خیر جو ہونا ہے۔ ہو رہے گا۔ بعد وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم اتنا کیوں دل جلا رہے ہو؟

(اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"میری جان! وہ پارسی قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروج تھی۔ اس میں خُر بہ خائے مضموم نورِ قاہر کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے ـــــ اسی واسطے آفتاب کو خُر لکھا۔ شید کا لفظ بڑھا دیا۔ شید بہ شین مکسورہ و یائے معروف بروزن عید روشنی کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ اُس نورِ قاہر ایزدی کی روشنی ہے۔ خُر اور شید یہ دونوں اسم آفتاب کے ٹھہرے۔ جب عرب و عجم مل گئے تو اکابر عرب نے کہا۔ کہ وہ منبع علوم ہوئے۔ واسطے دفع التباس کے خُر میں واو معدولہ بڑھا کر خور لکھنا شروع کیا۔ ہر آئینہ متاخرین نے اس قاعدے کو پسند کیا۔ اور منظور کیا اور فی الحقیقت یہ قاعدہ بہت مستحسن ہے۔ فقیر جہاں خُر بے اضافۂ لفظ شید لکھتا ہے موافق قانون علمائے عرب بہ واو معدولہ لکھتا ہے۔ یعنی خور اور جہاں بہ اضافۂ لفظ شید لکھتا ہے۔ وہاں بہ پیروی بزرگان پارسی مرز بوم لفظ خور کو بے واو لکھتا ہے۔ یعنی خرشید خُر کا قافیہ ذرہ اور بہ کے سلک جائز اور روا ہے۔

خور میں نے دو چار جگہ باندھا ہوگا۔ وہاں میں بے واو کیوں لکھوں؟ رہا خورشید؟ چاہو بے واو لکھو۔ چاہو مع الواو کو غلط نہیں جانتا اور خُر کو کبھی بے واو نہ لکھوں گا۔ قافیہ ہو یا نہ ہو۔ یعنی نظم میں وسطِ شعر میں آپڑے یا نثر کی عبارت میں واقع ہو۔ خور لکھوں گا۔

یہ بات بھی تم کو معلوم رہے کہ جس طرح خُر ترجمہ قاہر کا ہے۔ اسی طرح جم ترجمہ قادر کا ہے۔ کہ بہ اضافۂ لفظ شید۔ اسم شہنشاہ وقت قرار پایا ہے۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ سچ کہیے۔ کہیں وہاں کوئی مجتہد العصر نہ کہتا ہوگا؟ نہ کہو۔ تم کو کیا؟ میں نے کہا۔ تم نے مان لیا۔ اب کوئی کہے یا نہ کہے۔ میاں بدرالدین سے ایک مہر کھدوا دوں گا۔

"جناب مجتہد العصر میر سرفراز حسین"

بس تم یہ مہر خطوں پر۔ محضروں پر۔ تمسکوں پر کرنی شروع کرنا۔ سب کے سب تم کو مجتہد العصر کہنے لگیں گے۔

حکیم میر اشرف علی کو اور ان کے فرزند کو دعا پہنچے۔ میرن صاحب کو دعا پہنچے۔ بھائی میرن! اب وہ خس کا پردہ کھول ڈالا۔ صافیاں جھجر پہ لپیٹا ہوں۔ دم بدم بھگوتا ہوں۔ وہ لُو کہاں جو پردے سے لپٹ کر ہوا آتی کو لگے۔ اور پانی کو ٹھنڈا کرے۔ وہ پانی جو میر مہدی اور تم اور حکیم جی پیا کیے ہو۔ اب کہاں؟ شراب پندرہ دن کی اور باقی ہے۔ آئندہ خدا رزاق ہے۔

(۲؍ جولائی ۱۸۶۱ء)

ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں۔ جو دعا لکھوں؟ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو۔ مسودے کو۔ کاغذ کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔

یہاں خیریت ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا۔ اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔ کیوں سچ کہو۔ اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟

ہائے! کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو۔ وہ خط ہی نہیں ہے چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے۔ نخل بے میوہ ہے۔ خانہ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا۔ تمدادنہ کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ اور اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے۔ تو بھائی! ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے؟ ـــ اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودے کے ساتھ لکھنی تھی۔ اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو خفا نہ ہو۔

میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے۔ پھر نہ آئے۔ نثر فارسی نئی کیسی میں نے کہاں لکھی کہ تمہارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں؟ نواب فیض محمد خاں کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد علی خاں سے ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی کلو داروغہ بیمار ہو گیا تھا۔ آج اس نے غسلِ صحت کیا۔ باقر علی خاں کو مہینہ بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔ شہر چپ چاپ۔ نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے۔ نہ آہنی سڑک آتی ہے۔ نہ کہیں دمدمہ بنتا

ہے۔ دلی شہر شہر خموشاں ہے۔ کاغذ نبڑ گیا ورنہ تمہارے دل کی خوشی کے واسطے اور لکھتا ابھی۔

(یک شنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء)

سید صاحب!

کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں گے۔ حال سفر کا جو کچھ ہے ان کی زبانی سن لو گے۔ میں کیا لکھوں؟ میں نے بھی جو کچھ سنا ہے انہیں سے سنا ہے۔ ان کا اس طرح ناکام پھر آنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے۔ لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا تھا۔ کہ وہاں کچھ نہ ہوگا۔ سو روپے کی ناحق زیر باری ہوئی۔ چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسہ پر ہوئی تو مجھے شرم ساری ہوئی۔ میں نے اس چھیاسٹھ برس کی عمر میں اس قسم کی شرم ساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں۔ جہاں ہزار داغ ہیں۔ ایک ہزار ایک سہی۔ میر سرفراز حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں کر نہ ہو؟ "لسان الغیب" نے دس برس پہلے فرمایا ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا۔ سمجھ لیا جائے گا۔

"کلیاتِ اردو" کا چھاپہ تمام ہوا۔ اغلب کہ اسی ہفتے میں غایت اس مہینے میں ایک نسخہ بہ سبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے گا۔

کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا۔ تو وہ بھی چھاپہ جائے گا۔ قاطع برہان کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا۔ تو میں بے شرکت غیرے اس کو چھپواؤں گا۔ مگر یہ خیال محال ہے۔ میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے۔ "واللہ علیٰ کلِ شئی قدیر۔"

خدا کا بندہ ہوں۔ علی کا غلام۔ میرا خدا کریم۔ میرا خداوند سخی۔

"علی دارم چہ غم دارم"

وبا کی آنچ مدھم ہو گئی ہے۔ پانچ سات دن بڑا شور رہا۔ پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچوں کے دلی میں آیا۔ کل رات کو اس کا نو برس کا لڑکا ہیضہ کر کے مر گیا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون۔" الور میں بھی وبا ہے۔

الگزنڈر ہیدرلے مشتہر بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راجہ میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اس جرم میں ماخوذ ہو کر مرا؟ خیر! یہ عالم اسباب ہے۔ اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

(جمعہ ۱۷ محرم ۷۸ھ ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء)

جانِ غالب!

اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا۔ کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں۔ تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے۔ کئی بار۔ میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ اب کی بار دو دن مجھ کو غفلت بہت رہی۔ اکثر احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں۔ سید صاحب نہیں آئے۔ تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے۔ اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں۔ جتنی گرد اڑی۔ اس کو آپ نے از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ بہرحال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا۔ میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا کہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں۔ اور میرن صاحب میرے پاس الفت پر خبر پائیں۔

(چہار شنبہ ۶ جون ۱۸۶۰ء)

جانِ غالب!

تمہارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچی ہے۔

"ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے:

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبے کا ہو گیا؟

اے میر مہدی! تجھے شرم نہیں آتی۔

"میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے۔"

ارے! اب اہل دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں۔ یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی، پُروا ہوا اب کہاں؟ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت وضعت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال می گزرد۔

مصیبت عظیم یہ ہے۔ کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے: پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال معلوم کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں۔ وہ اگر اٹھ جائیں۔ تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو۔ مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب

ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلّی نہ رہی۔ دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الکزنڈر ہڈرلے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔”

(۷، جون ۱۸۶۱ء)

بھائی!

کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ر دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں، اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کلکٹر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے۔ تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود اہل اسلام میں سے صرف تین لوگ باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفٰے خاں۔ سلطان جی میں مولوی صدرالدین۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ۔ جاں نثار کے چھتے کی سڑک۔ خاں چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ۔ چلے جاؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا۔ حکیم الملک حکیم میر اشرف علی کو دعا۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا، یوسف ہند میر افضل علی کو دعا۔”

(مرقومہ صبح جمعہ ۱۶ر جمادی الاوّل ۲ر دسمبر سال حال ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء)

میاں! کیوں ناسپاسی و حق ناشناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے۔ تمہارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں۔ جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟

خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت مفصل لکھو۔ تم تو زحیر کی عادت رکھتے ہو۔ عوارض چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے نور چشم کی آنکھ کیوں دکھی؟

دریہ بال بال بچ گیا۔ جو اس کے خلاف کہے۔ اس کو غلط جانتا۔ میں نے خط تمہیں جان کر نہیں لکھا۔ تم نے لکھا تھا کہ بعد عید میں وہاں آؤں گا

مجھ کو خط لکھنے میں تامل ہوا۔ لکھتے کچھ ہو۔ کرتے کچھ ہو؟
تنخواہ کی سنو!

تین برس کے روپے دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئے۔ سو مدد خرچ کے جو پائے تھے۔ وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو عملہ فعلہ کی نذر ہوئے۔ مختار کار دو ہزار لایا۔ چوں کہ میں اس کا قرض دار ہوں روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ حساب کیا۔ سود مول۔ سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ میں نے کہا، میرے قرض متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے۔ میں کہتا ہوں۔ یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے۔ نو سو بچے۔ آدھے تو لے، آدھے مجھے دے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو۔ پانسو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا۔ تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو۔ تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں۔ جب تک جیوں گا۔ ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا معجزۂ اسد اللہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ ید اللّٰہی ہے۔ حاکم شہر لکھ دے۔ کہ یہ شخص ہرگز پنشن پانے کا مستحق نہیں۔ حاکم صدر مجھ کو پنشن دلوائے اور پورا دلوائے؟

میرن صاحب کو دعا کہتا ہوں۔ اور مزاج کی خبر پوچھتا ہوں۔ جو اب تم کی تمہ کی۔ جواب عربی عربی جو انھوں نے لکھا۔ وہ میں نے بھی لکھا۔ مجتہد العصر کو بندگی لکھوں۔ دعا لکھوں، کیا لکھوں؟ نہیں بھئی! وہ مجتہد ہوں۔ ہوا کریں۔ میرے تو فرزند ہیں۔ میں تو دعا ہی لکھوں گا اور اسی طرح میر نصیر الدین کو بھی دعا۔

(یکم مئی ۱۸۶۰ء)

میری جان!

تم کو تو بے کاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے۔ اگر خط پہنچا ہے۔ تو جواب۔ ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔

حکیم اشرف علی آئے تھے سر منڈوا ڈالا ہے۔ محلقین رؤسکم پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو ڈاڑھی رکھو۔ کہنے لگے۔

”دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم“

واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔ کہتے تھے کہ میر احمد علی صاحب آگئے بہ حال و برقرار ہے۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ کبھی تو ایسا بھی ہو کہ کسی عزیز کی اچھی خبر سن جائے۔ میرا سلام کہنا اور مبارک باد دینا خبردار بھول نہ جائیو!

تمہاری شکایت ہائے بے جا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجھ کو پانی پت سے بھیجا تھا اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی۔ میں نے یہ تجویز کر لیا تھا۔ کہ جب کرنال سے خط آئے گا تو میں جواب لکھوں گا آج شنبہ ۱۵ر اکتوبر صبح کا وقت ہے۔ ابھی کھانا پکا بھی نہیں تبرید پی کر بیٹھا تھا کہ تمہارا خط آیا۔ اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔ کلیان بیمار ہے۔ ایاز کو خط دے کر ڈاک گھر روانہ کیا۔ بولو۔ تمہارا گلہ بے جا یا

بجا؟ بھائی گلہ کرو، تو اپنے سے کرو کہ تم نے کرنال پہنچ کر خط لکھنے میں کیوں دیر کی؟ اور ہاں یہ کیا ہے! کہ بہت دن سے نہ ان کی خیر و عافیت نہ ان کی بندگی؟ اگر وہ مجھ سے خفا ہیں۔ تو ان کی بندگی نہ لکھتے خیر و عافیت تو لکھتے؟ یہ باتیں اچھی نہیں۔

میرن صاحب کے باب میں حیران ہوں۔ تنہا تمہارے ساتھ گئے ہیں۔ والدہ ان کی پانی پت میں ہیں۔ وہاں کوئی مکان لے کر والدہ کو وہیں بلائیں گے یا خود بعد چند روز کے یہاں آجائیں گے۔ یہ دو باتیں جواب طلب ہیں۔ میر نصیر الدین کی بندگی نہ لکھنے کا سبب اور میرن صاحب کے بود و باش کی حقیقت لکھو۔ رہا میرا پنشن۔ اس کا ذکر نہ کرو۔ اگر ملے گا۔ تو تم کو اطلاع دی جائے گی۔

شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرائے کو مکان ملنے لگے۔ چار سو پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے۔ آئندہ کیا ہوگا؟ سلطان العلماء مجتہد العصر مولوی سید سرفراز حسین کو اگرچہ بنظر ان کے مدارج علم و عمل پہ بندگی چاہیئے۔ مگر خیر میں عزیزداری و یگانگی کی راہ سے دعا لکھتا ہوں۔ میرن صاحب کو دعا اور بعد دعا کے بہت سا پیار۔ میر نصیر الدین کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں؟

(صبح شنبہ ۱۵؍اکتوبر ۱۸۵۹ء)

• واہ حضرت!

کیا خط لکھا ہے؟ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہے۔ کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا۔ میرا بچھونا مجھ کو ملا۔ میرا حمام مجھ کو ملا۔ میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور۔ کوئی آئیو — کوئی آئیو فرو ہو گیا۔ میری جان بچی۔ میرے آدمیوں کی جان بچی۔

"اکنوں شب من شب است و روزم روز است"

بھئی تم نے یہ نہ لکھا کہ میرن صاحب کو میرا خط پہنچا یا نہ پہنچا۔ میں گمان کرتا ہوں کہ نہیں پہنچا۔ اگر پہنچتا تو بے شک وہ تمہاری نظر سے گزرتا۔ اور میرن صاحب اس کی اصل حقیقت تم سے پوچھتے اور اس صورت میں یہ بھی ضرور تھا کہ تم اس واہیات کے بدلے مجھ کو وہ رُوداد لکھتے۔ جو میرن صاحب میں اور تم میں پیش آئی۔ پس اگر جیسا کہ میرا گمان ہے۔ خط نہیں پہنچا۔ تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہنچا ہے۔ تو میرن صاحب کے خط کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب ان سے میرے خط کے جواب کا تقاضہ کیوں نہیں کرتے؟ حسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں۔ جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم ان سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو۔ میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے۔ نہ صاحب۔ یہ کچھ بات نہیں۔ میرے خط کا جواب ان سے لکھوا کر بھجواؤ۔ یہاں کا حال وہ ہے۔ جو دیکھ گئے ہو۔ پانی گرم، ہوا گرم، تپش مستولی، اناج مہنگا۔ بے چارہ منشی میر احمد حسین کا بھتیجا یعنی میر امداد علی آشوب کا بیٹا۔ محمد میر شب گزشتہ کو گزر گیا۔ آج صبح کو اس کو دفن کر آئے، جوان صالح، پرہیزگار مومنین کا پیش نماز تھا۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون"

مجتہد العصر کا حکم بجالاؤں گا۔ اور نہ رئیس کو بلکہ مدار المہام ریاست کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کا جواب قلم انداز کر جاتے گا۔ اور مدار المہام امر واقعی لکھ بھیجے گا۔

مجتہد العصر کو دعا کہنا۔ اور یہ خط پڑھا دینا۔ میرن صاحب کو دعا دینا اور کہنا کہ بھلا صاحب۔ تم نے ہمارے خط کا جواب نہیں لکھا۔ ہم بھی تمہاری طرز کا تتبع کریں گے۔ حکیم محمد اشرف علی کو دعا کہنا اور کہنا کہ اگر تم بھی ان میں راہ و رسم تعزیت و تہنیت ہو۔ تو میر احمد حسین کو خط لکھو اور یہ بھی ان کو معلوم ہو۔ کہ حفیظ یہاں آیا ہوا ہے۔ قبائل تمہارے یہیں ہیں۔ اگر وہاں کچھ رسائی حاصل ہو۔ تو خیر ورنہ یہاں کیوں چلے آؤ۔

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی، سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے۔ جو دروازہ تھا وہ گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں۔ قلم دان سب توشے خانے میں فرش پہ کہیں لگن رکھا ہوا۔ کہیں چلپچی دھری ہوئی۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں؟ چار پانچ دن سے فرصت ہے۔ مالک مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی۔ کہا۔ کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔

الور کی ناخوشی۔ راہ کی محنت کشی۔ تپ کی حرارت۔ گرمی کی شرارت یاس کا عالم۔ کثرت اندوہ و غم۔ حال کی فکر، مستقبل کا خیال۔ تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال۔ جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے سنتے ہیں۔ کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہوگا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا ہے۔ بارے رفع مرض کا حال لکھو۔ خدا کرے۔ تپ جاتی رہی ہو۔ تندرستی حاصل ہو گئی ہو۔ میر صاحب کہتے ہیں۔

تندرستی ہزار نعمت ہے

ہائے! پیش مصرع مرزا قربان علی بیگ سالک نے کیا۔ خوب بہم پہنچایا ہے۔ مجھ کو پسند آیا ہے۔

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا۔

ہا ہا ہا۔ میر افضل علی صاحب کہاں ہیں؟ حضرت یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ لکھنو کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں۔ ہاں بھئی میرن صاحب! بھلا ان کو ہماری دعا کہنا۔

(صبح جمعہ ۲۶؍ستمبر ۱۸۶۲ء)

•

بے مے نہ کند در کفِ من خامہ روانی
سرد است ہوا آتشِ بے دود کجائی

میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، آگ تاپتا جاتا ہوں۔ گرمی میں گرمی نہیں۔ مگر ہائے آتشِ سیال کہاں! کہ جب دو جرعے پی لیے۔ فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!

میاں تم پنشن پنشن کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنشن کہاں؟ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر، نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کر دوں ہم تجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنشن کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے ہاں کیا۔ ع

دیکھیے کیا جواب آتا ہے

بہر حال جو کچھ ہو گا تم کو لکھا جائے گا۔

اجی، وہ یوسفِ ہند نہ سہی، یوسفِ دہر سہی، یوسفِ عصر سہی، یوسفِ کشور سہی، ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے کہ میں ساڑھے سات روپے مہینا بھیجے جاؤں گا۔ اب ان کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں، خرچ جلد بھیجے دو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہر حال میرن صاحب کو یہ عبارت پڑھوا دینا۔ سرفراز حسین کو دعا۔ یوسف ہفت کشور کو دعا۔

(۱۲، دسمبر ۱۸۵۹ء)

سید صاحب! اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علیؑ کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال ہے کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے۔ دوست ہوں، عاشق زار نہیں۔ بندۂ مہر و وفا ہوں، گرفتار نہیں۔ تمہارے بھائی نے سخت متشوش بلکہ نعل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے میں بھی آؤں گا۔ میں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں۔ وہ آئیں گے تو یہاں ان کو دوں گا۔ محرم تمام ہوا ہے۔ آج سہ شنبہ ہے حضرت کا پتہ نہیں۔ ظاہراً برسات نے آنے نہ دیا۔ برسات کا نام آ گیا۔ سو پہلے تو مجملاً سنو! ایک غدر کالوں کا۔ ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کا۔ ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آتی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا، ہزارہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر، وہ اَن کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا، یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنہوں نے ابھی نہیں بویا تھا۔ وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جناب میرن کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں؟

(۲۹، جولائی — ۱۸۶۲ء)

میری جان!

تو کیا کہہ رہا ہے؟ "بنیے سے سیانا سو دیوانہ" صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو ن سمجھے گا۔ جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں کی پرورش میں کرتا ہوں؟ "استغفر اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ" یا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں شیخ چلی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا اور اس کے انڈے بیچ بیچ کر بکری خریدوں گا اور پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہو گا۔ بھائی! یہ تو میں نے اپنا راز دل تم سے کہا تھا کہ آرزو یوں تھی اور اب وہ نقش باطل ہو گیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا، نہ خواہش کا۔

دیکھا اس پنشن قدیم کا حال؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔ لیکن جب تک جواب نہ پاؤں، کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے۔ دیکھیے کب آئے؟ آئے تو مجھے دربار میں بلائے یا نہ بلائے! خلعت ملے یا نہ ملے؟ یہ بیچ میں ایک اور پیچ آپڑا ہے۔ اس کو دیکھ لوں اور پھر صرف اسی کا انتظار نہیں اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنشن کے ملنے نہ ملنے کا تردد بدستور رہے گا۔ یک سیر کیونکر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں؟ پنشن جاری ہونے پر بھی تو سوا رام پور کے کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں، تین برس ثبات قدم اختیار کیا۔ اب انجام کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟ چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت جیسا مناسب ہوتا ہے ویسا عمل میں آتا ہے۔

صاحب! میرن صاحب نے دو سطریں دستخطِ خاص سے لکھی تھیں واللہ میں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمے کا ذکر ہے۔

(یکم نومبر ۱۸۵۹ء)

؎ دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا اٹھتا ہے

بندہ پرور! تم کو پہلے یہ خط لکھا جاتا ہے۔ کہ میرے دوست قدیم میر کرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو معلوم بھی نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب کی جناب میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر اپنی زبان سے پڑھ دینا۔

؎ شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب
اے تو غائب نہ نظر، مہر تو ایمان منست

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن

کے بعد دوسرا خط پہنچا۔

سفو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا شوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے۔ اس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ فقط بہ طرف شعر و سخن کے تمہاری شرافتِ نفس اور حسنِ طبع کی دلیل ہے۔ اور جمال جو تمہاری سخن گستری ہے۔ اس کی شہرت میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے۔ تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

شعر

؎ زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

؎ اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے۔ اس کا بیان تو معلوم۔ مگر اس ______ بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو؟

ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۱۸۵۸ء)

(منشی ہرگوپال تفتہ کے نام)

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے؟

"علاقہ محبتِ ازلی کو برحق مان کر اور پیوندِ غلامیِ جناب مرتضیٰ علیؓ کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اسی کے اجا رے میں آئی ہے۔ یہ بھی دلیل آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وادید نہ ہولے۔ اپنے کو بیگانۂ یک دگر سمجھیں؟ البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں اگر سمجھیں! سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان ہے۔ خدا کرے کہ وہ خط جس میں، آپ کو میں نے سلام لکھا تھا۔ آپ کی نظر سے گزر گیا ہو یعنی اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجیے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دوبالا کیجیے گا۔

ہائے میجر جان جاکوب! کیا جوان مارا گیا ہے! سچ اس کا یہ شیوہ تھا۔ کہ اردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ بندہ نواز! یہ بھی انہیں میں سے ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں؟ اور کس سے فریاد کروں جیوں تو کوئی غم خوار نہیں اور مروں تو کوئی عزا دار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ! چشمِ بد دور! اردو کی راہ کے تو سالک ہو۔ گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی پایۂ خوبی میں کم نہیں۔ مشق شرط ہے۔ اگر کہے جاؤ گے۔ سلطنت پاؤ گے۔ میرا تو بہ قول طالب آملی اب یہ حال ہے۔

؎ لب از گفتن، چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے (خط) مجھ کو لکھا ہے تو کیوں کر مجھ کو اپنے خط کے جواب کی نہ تمنا ہو؟ پہلے تو اپنا حال لکھیے کہ میں نے سنا تھا کہ آپ کہیں کے صدر امین ہیں۔ پھر آپ اکبر آباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟ اس ہنگامے میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی؟

راجہ بلوان سنگھ کا حال بھی لکھنا ضرور ہے کہ کہاں ہیں اور وہ دو ہزار روپیہ مہینہ جو ان کو سرکار انگریزی سے ملتا تھا اب بھی ملتا ہے یا نہیں: ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟ کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی۔ امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔

پتہ مسکن مبارک کا کشمیری بازار سے زیادہ معلوم نہیں ہوا۔ ظاہرا اسی قدر کافی ہوگا ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔ مرزا تفتہ کو دعا کہیے گا۔ اور ان کے اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دیجیے گا۔ جس میں آپ کے خط کی انہوں نے نوید لکھی تھی۔ والسلام:

مرزا حاتم علی مہر کے نام (جولائی ۱۸۵۸ء)

بندہ پرور!

"آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہر انگیز اور محبت آمیز باتوں نے غم بے کسی بھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے۔ کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے "ید بیضا" ڈھونڈ نکالا ہے۔ آفریں! صد ہزار آفریں! تیسرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے ؏

نامہ خود سال خویش داد نشاں

مرزا تفتہ کا خط ہاترس سے آیا۔ ان کے لڑکے بالے اچھے ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ آئے کہ آئے ہیں۔ اگر تمہیں بغیر ان کے آرام نہیں تو ان کو بغیر تمہارے چین کہاں؟

صاحب بندہ! اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ لکھا کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ہم تم ایک

آقا کے غلام ہیں۔ تم جو مجھ سے محبت کرو گے یا میری غم گساری میں محنت کرو گے۔ کیا تم کو غیر جانوں جو تمہارا احسان مانوں؟ تم سراپا مہر و وفا ہو۔ واللہ اسم با مسمے ہو۔

مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے۔ اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے بہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے صحت الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختم کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیو نرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی۔ سب طرح میرے پسند آئی۔ چنانچہ ان کو لکھ بھیجا ہے۔ اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو۔

حضرت! چار جلدیں یہاں کے حکام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ! اللہ! کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر۔ بہرحال یہ ہوس تھی اور شاید اب بھی ہو کہ اب چھ جلدوں کی کچھ تزئین و آرائش کی جائے۔ آپ اور بھائی صاحب اور ان کا فرزند رشید منشی عبد اللطیف اور منشی شیو نرائن، یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور یہ اجلاس کونسل یہ امر تجویز کیا جاوے کہ کیا کیا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ چار جلدیں چھ روپے میں اور دو جلدیں چھ روپے میں تیار ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ یارب آرائش کی گنجائش کہاں! ناچار چار کتابوں کی جلد ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کی اور دو کتابوں کی جلد تین تین روپے کی بنائی جائے۔ قصہ مختصر کچھ کیا جائے یا یہی کہہ دیا جائے کہ تیری رائے کونسل میں مقبول اور صرف جلدوں کی تیاری منظور ہوئی۔ بارہ روپے بھیج دے۔

مطالب اور مقاصد تمام ہوئے اور ہم تم بزبانِ قلم باہم دگر ہم کلام ہوئے۔

مرزا حاتم علی مہر کے نام
(ستمبر ۱۸۵۸ء)

مرا بہ سادہ دلی ہائے من تواں بخشید
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

کل دوشنبہ کا دن ۲۰؍ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا اور بیرنگ ڈاک میں بھیج دیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ ایک تمہارا اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں، وہ نہیں پہنچا۔ کچھ شکوے سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ لگانے لگا۔ بکس میں سے وہ تمہارے نام کا خط نکل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔ اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو۔ بعد چاہنے عفو جرم کے آپ کے کل کے خط کا جواب لکھتا ہوں۔

سبحان اللہ! جلدوں کی آرائش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے۔ میرے دل میں بھی ایسی ہی باتیں تھیں۔ یقین ہے کہ متاع شاہوار ہو جائیں گی۔ ابادہ اگر ہو جائے گا تو حرف خوب چمک جائیں گے۔ اس کا خیال ان چار جلدوں میں بھی رہے۔ بارہ روپے کی ہنڈوی پہنچتے ہی روپیہ وصول کر کے مجھ کو اطلاع دیجیے گا۔ ورنہ میں متشوش رہوں گا۔

حضرت یہاں دو خبریں مشہور ہیں۔ ان کی میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں، آگرے میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ ہے کہ کلکتے کے چیف سکمیٹر، اکبر آباد کے لفٹیننٹ گورنر ہو گئے۔ خبریں دونوں اچھی ہیں۔ خدا کرے سچ ہوں اور سچ ہونا ان کا آپ کے لکھنے پر منحصر ہے۔

اس خط کو میں لکھ کر بند کر چکا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ میرے مشفق منشی شیو نرائن صاحب کا خط لایا۔ بارے قصیدے کا مسودہ پہنچ گیا اور منشی صاحب نے اس کا چھاپنا قبول کیا۔ یہ تشویش بھی رفع ہو گئی۔ اب ان سے میرا سلام کہیے گا۔ اور یہ ان کو اطلاع دیجیے گا کہ اخبار کا لفافہ ہرگز مجھ کو نہ پہنچا۔ ورنہ کیا امکان کہ میں اس کی رسید نہ لکھتا۔

مرزا حاتم علی مہر کے نام
(۳۰؍ ستمبر ۱۸۵۸ء)

مرزا اسد اللہ خان غالب کے سوانح، حالاتِ زندگی، ان کی اردو اور فارسی نثر، ان کے دیباچے، تقریظیں، فارسی میں ان کی غزل کے نمونے اور ان پر انتقاد ممتاز نقادانِ اردو ادب کے حوالوں سے پیش کیے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے اپنے خطوط منتخب کر کے درج کیے گئے جن سے غدر کے دوران اور بعد کے زمانے کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے اور اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھتا ہے کہ مرزا غالب کا خود جنگ آزادی کے بارے میں کیا رویہ تھا۔

حج کے بارے میں ملک کے معروف ادیب
جناب ممتاز مفتی کا ایک خوبصورت
سفرنامہ

لبیک
(دو حصوں میں)

روشن کتابوں میں شائع ہو گیا ہے

آج ہی

اپنے قریبی بکسٹال / ہاکر سے طلب فرمائیں!
قیمت حصہ اول ۳/۵۰ روپے
قیمت حصہ دوم ۳/۵۰ روپے

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

روشن کتابیں